سلسلۂ ابوالکلام آزاد صدی تقریبات

انتخاب

غبارِ خاطر

ابوالکلام آزاد

اترپردیش اردو اکادمی
لکھنؤ

سلسلۂ مطبوعات ۴۲۶

سلسلۂ ابوالکلام آزاد صدی تقریبات ۱۹۸۸
(۱)

انتخاب
غبارِ خاطر

ابوالکلام آزاد

اترپردیش اردو اکادمی
لکھنؤ

© اتر پردیش اردو اکادمی

انتخاب غبارِ خاطر

ابوالکلام آزاد

مجلس مشاورت

پروفیسر محمود الٰہی، پروفیسر سید شبیہ الحسن
پروفیسر قاضی عبدالستار، پروفیسر سید محمد عقیل رضوی
پروفیسر حکم چند نیر

چوتھا ایڈیشن: ۲۰۰۳ء

تعداد: دو ہزار

قیمت: چودہ روپے

محمد نجم الحسن، سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی نے میسرس ناردرن آفسیٹ پریس، ٹکیت رائے تالاب، موہان روڈ، لکھنؤ سے چھپوا کر اکادمی کے دفتر وبھوتی کھنڈ گومتی نگر، لکھنؤ سے شائع کیا۔

ترتیب

پیش لفظ (طبع ثانی) ۴

پیش لفظ (طبع اول) ۵

۱۔ مکتوب مورخہ ۲۴ر اگست ۱۹۴۵ ۱۳

۲۔ مکتوب مورخہ ۳ر ستمبر ۱۹۴۵ ۱۵

۳۔ مکتوب مورخہ ۳ر اگست ۱۹۴۲ ۱۹

۴۔ مکتوب مورخہ ۱۰ر اگست ۱۹۴۲ ۲۷

۵۔ مکتوب مورخہ ۱۱ر اگست ۱۹۴۲ ۴۰

۶۔ مکتوب مورخہ ۱۵ر اگست ۱۹۴۲ ۵۳

۷۔ مکتوب مورخہ ۲۷ اگست ۱۹۴۲ ۶۱

۸۔ مکتوب مورخہ ۱۱ر اپریل ۱۹۴۳ ۷۲

۹۔ مکتوب مورخہ ۱۶ر ستمبر ۱۹۴۳ ۸۰

اکادمی کی بات

اکادمی اپنی مختلف اسکیموں کے ذریعہ سے اردو کی ترقی و ترویج میں ہمیشہ سے ہی مستعد ہو کر کام کرتی رہی ہے۔ چنانچہ اشاعتِ کتب کے میدان میں بھی اس کا نمایاں کردار رہا ہے اور معیاری کتابوں کی اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ داری نباہی ہے۔ اس میں طلبا کے مفادات کی مطبوعات کا بطورِ خاص لحاظ رکھا جاتا رہا ہے۔ محدود وسائل کے پیشِ نظر ایسا کرنا ناگزیر بھی ہے۔

اس بات سے کون واقف نہیں ہے کہ ریاست اتر پردیش کی مالی حالت گزشتہ چند برسوں سے ڈانواڈول ہے اور اسی وجہ سے ریاست کی ترقی و تعمیر میں مختلف محکموں کی خدمات بھی متاثر ہوئی ہیں۔ اتر پردیش اردو اکادمی کا بھی متاثر ہونا فطری سی بات ہے۔

مالی طور سے خستہ حالی کا زیادہ دنوں تک برقرار رہنا کسی ادارے کے وجود کے لیے جہاں زوال کا سبب بن سکتا ہے وہیں ریاست اتر پردیش کو بھی بربادی کی کھائی میں گرا سکتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی جانب توجہ دلاتی ہے کہ اداروں کو اپنے وجود کی بقا کے لیے خود کفیل ہونا پڑے گا اور اس کے لیے آمدنی کے وسائل بھی خود ہی تلاش کرنا ہوں گے۔

چنانچہ اسی بات کو دھیان میں رکھ کر اکادمی نے بھی اپنے نظریے میں کچھ تبدیلی کی ہے۔ یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ اکادمی کی اشاعت کتب کی اسکیم مالی وسائل کو بڑھانے میں موثر اور مددگار ثابت ہو سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ وسائل بڑھنے سے ہی فعال ادارے کے روپ میں اس کی پہچان بھی پھر سے بحال ہو سکے گی۔

تیز عمل آوری سے جلد مثبت نتائج حاصل ہو سکیں، اس کے لیے اب ایسا بندوبست کر دیا گیا ہے کہ اکادمی کی شائع کردہ مطبوعات کے فروخت ہونے سے جو آمدنی اکادمی کو ہوگی اسے واپس اشاعتِ کتب کی اسکیم میں ہی لگایا جا سکے گا۔

امید کی جاتی ہے کہ اکادمی کی موجودہ تحریک میں اُردو دُنیا بھی عملی تعاون کا مظاہرہ کرے گی اور زیرِ نظر کتاب کا یہ ایڈیشن نہ صرف اردو کی ترقی و ترویج میں بلکہ اکادمی کے وسائل بڑھانے میں بھی شرفِ قبولیت حاصل کرے گا تاکہ پہلے سے شائع مطبوعات کے نئے ایڈیشنوں کی اشاعت کے ساتھ ہی اکادمی نئی مطبوعات کی اشاعت پر بھی عمل کرا سکے۔

(ڈاکٹر) نور محمد
صدر

اتر پردیش اردو اکادمی،
لکھنؤ۔ مورخہ ۱۰ دسمبر ۲۰۰۲ء

پیش لفظ

(طبع اوّل)

لوگ کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد (۱۹۵۸ - ۱۸۸۸ء) مذہب کے راستے سے سیاست میں داخل ہوئے، لیکن وہ 'جس زمیں پہ رہے، آسماں رہے'۔ وہ دینیات کے منتہی تھے اور سیاست کے امام۔ ان دونوں موضوعات پر ان کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ انھوں نے جو کچھ بھی کہا، وہ اصابت رائے کا خوب صورت نمونہ ثابت ہوا۔ سیاسیات کے باب میں ماضی کے مشاہدہ و مطالعہ پر انھوں نے حال کی بنیاد رکھی لیکن نگاہ ان کی مستقبل پر رہتی تھی۔ لوگ ماضی اور حال سے مستقبل کی تشکیل کرتے ہیں مگر مولانا کا تصورِ مستقبل آج حال کی صورت میں سامنے ہے۔ مولانا دو قدمی نظریے کے مخالف تھے اور اس کے لیے انھیں فیض احمد فیض کے اس مصرعے کا مصداق بننا پڑا:

تنہا پسِ زنداں کبھی رُسوا سرِ بازار

لیکن آج دو قدمی نظریے کا بڑے سے بڑا حلیف مولانا کی دروں بینی اور دور اندیشی کا قائل نظر آتا ہے۔

زبان نہ تو جذبہ ہوتی ہے اور نہ نظریہ لیکن مولانا نے زبان کو جذبہ بھی بنایا اور نظریہ بھی۔ ان کی اردو بڑی دور سے پہچان لی جاتی ہے کیوں کہ وہ جذبے اور نظریے میں ڈھل کر سامنے آتی ہے۔ مولانا کی تحریروں کے چند اقتباسات کا جس نے مطالعہ کر لیا ہے وہ ہمیشہ اور

ہر حال میں دوسروں کے اسالیب سے ان کے اندازِ نگارش کو ممیز و ممتاز کرتا رہے گا۔ یہ صحیح ہے کہ ترجمان القرآن، تذکرہ، مضامین الہلال اور خطبات کے تقابلی مطالعے سے ان کے اسالیب کچھ متفاوت نظر آتے ہیں لیکن یہ تفاوت ملبوسات کا ہے، اندازِ قد کا نہیں، کمیت کا ہے، کیفیت کا نہیں۔

مولانا کے اسلوب کا ایک مظہر "غبارِ خاطر" ہے۔ یہ وہ اسلوب ہے جسے 'جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں' کا مصداق کہا جا سکتا ہے۔ یہاں مولانا کی 'کج کلہی' زیادہ نمایاں ہو گئی ہے۔ جب طالع بیدار کسی کو رات بھر سونے نہیں دیتا تو اس کو طرب آگیں بے خوابی کہتے ہیں۔ اسی طرب آگیں بے خوابی کے جلوے غبارِ خاطر میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ جلوے لذت اندوزی کے نمونے ہیں لیکن جسم اور ذہن کی لذت اندوزی نہیں، روح کی لذت اندوزی!

ہم لوگ عام اصطلاح میں غبارِ خاطر کو زندانی ادب کے زمرے میں شمار کرتے ہیں کیوں کہ ان کی تسوید اس وقت عمل میں آئی تھی جب مولانا قلعۂ احمد نگر میں اسیر و نظر بند تھے۔ اسیری کی روداد مولانا کی زبانی سنیے:

"نو مہینے ہوئے، ۴ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو نینی کے مرکزی قید خانے کا دروازہ میرے لیے کھولا گیا تھا۔ کل ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کو سوا دو بجے قلعۂ احمد نگر کے حصار کہنہ کا نیا پھاٹک میرے پیچھے بند کر دیا گیا.....

۴ر اگست کو بمبئی پہنچا..... ۴ر سے ۷ر اگست تک (انڈین نیشنل کانگریس کی) ورکنگ کمیٹی کے اجلاس ہوتے رہے ۷ر کی دوپہر سے آل انڈیا کمیٹی شروع ہوئی۔ معاملات کی رفتار

ایسی تھی کہ کارروائی تین دن تک پھیل سکتی تھی اور مقامی کمیٹی نے تین ہی دن کا انتظام بھی کیا تھا لیکن میں نے کوشش کی کہ دو دن سے زیادہ بڑھنے نہ پائے۔ ۸ر کو دو بجے سے رات کے گیارہ بجے تک بیٹھنا پڑا.... تھکا ماندہ قیام گاہ پر پہنچا..... حسب معمول (۹ر اگست کو) چار بجے اٹھا..... پھر کیا دیکھتا ہوں کہ کئی کاریں مکان کے احاطے میں داخل ہو گئی ہیں اور اس بنگلے کی طرف جا رہی ہیں جو مکان کے پچھواڑے میں واقع ہے اور جس میں صاحبِ مکان کا لڑکا دھیرو رہتا ہے۔ پھر خیال ہوا، میں خواب دیکھ رہا ہوں اور اس کے بعد گہری نیند میں ڈوب گیا.... شاید اس حالت میں دس بارہ منٹ گزرے ہوں گے کہ کسی نے میرا پیر دبایا، آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ دھیرو ایک کاغذ ہاتھ میں لیے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے دو فوجی افسر ڈپٹی کمشنر کے ساتھ آئے ہیں اور یہ کاغذ لائے ہیں۔ گو اتنی ہی خبر میرے لیے کافی تھی مگر میں نے کاغذ لے لیا کہ دیکھوں:

کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

..... باہر نکلا تو پانچ بج کر ۴۵ منٹ ہوئے تھے.....
کار باہر نکلی تو صبح مسکرا رہی تھی..... کار وکٹوریہ ٹرمینس اسٹیشن پر پہنچی تو اس کا پچھلا حصہ ہر طرف سے فوجی پہرے کے حصار میں تھا.... مسافروں کا داخلہ روک دیا گیا تھا۔ صرف ایک پلیٹ فارم پر کچھ ہلچل دکھائی دیتی تھی کیونکہ ایک انجن رسٹورنیٹ کار کو ڈھکیل ڈھکیل کر ایک ٹرین سے جوڑ رہا تھا۔ معلوم ہوا یہی کاروانِ خاص ہے جو ہم زندانیوں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔
.... دو بجنے والے تھے کہ ٹرین احمد نگر پہنچی..... اسٹیشن سے

قلعے تک کی مسافت زیادہ سے زیادہ دس بارہ منٹ کی ہوگی۔ قلعے کا حصار پہلے کسی قدر فاصلے پر دکھائی دیا پھر یہ فاصلہ چند لمحوں میں طے ہوگیا۔ اب اس دنیا میں جو قلعے سے باہر ہے اور اس میں جو قلعے کے اندر ہے، صرف ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ چشم زدن میں یہ بھی طے ہوگیا اور ہم قلعے کی دنیا میں داخل ہوگئے۔"

غبار خاطر کے خطوط نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھے گئے تھے۔ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ میں جو ربط خصوصی تھا، اس کا ذکر پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی نے بڑی وضاحت کے ساتھ اپنے مقالہ "مولانا ابوالکلام آزاد اور نواب صدر یار جنگ" میں کیا ہے۔ مقالے کے بعض اقتباسات یہ ہیں:

"امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء-۱۹۵۸ء) اور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (۱۸۶۷ء-۱۹۵۰ء) کے تعلقات سے عام طور پر لوگ "غبار خاطر" کی اشاعت سے پہلے بہت کم واقف تھے۔ ان دونوں کے حالات و واردات میں جو تفاوت تھا اس کے پیش نظر ایسا ہونا قدرتی امر تھا۔ مولانا کی زندگی کا سب سے اہم داعیہ جہاد حریت کی گرم بازاری تھا جب کہ نواب صاحب خاموش اور پرسکون زندگی کے شیدائی تھے۔ نتیجے میں ایک کے شب و روز کا بڑا حصہ قید خانے کی چہار دیواری میں گزرا اور دوسرے کا ریاست حیدرآباد کی مسند وزارت پر، لیکن دونوں کے درمیان ایک قدر مشترک ایسی تھی جو دوسرے اختلافات پر حاوی رہی اور جس نے زندگی بھر کی ذہنی رفاقت اور قلبی تعلق کی صورت اختیار کرلی۔ یہ قدر مشترک علمی ذوق اور ثقافتی ہم آہنگی تھی۔ دونوں کو فارسی

شعر و ادب سے گہرا لگاؤ تھا اور دونوں اپنے اپنے طور پر اسلامی ثقافت اور روایات کے بہترین نمائندے تھے .....

"کاروان خیال" میں مولانا آزاد کا پہلا خط ۴ ستمبر ۱۹۴۰ء کا لکھا ہوا ہے اور اسی خط سے "مراسلتِ حبیبین" کے اس سلسلے کا آغاز ہوتا ہے جو "کاروان خیال" اور "غبار خاطر" کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا.....

نواب صاحب اور مولانا کی پہلی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی تھی جب مولانا "الندوۃ" کی ایڈیٹری کے سلسلے میں وہاں مقیم تھے یہ ۱۹۰۵ء کی بات ہے ..... اس کے بعد نواب صاحب اور مولانا کی ملاقاتوں کا سلسلہ وقفوں کے ساتھ ۱۵ برس تک جاری رہا۔ اس سلسلے کی آخری ملاقات مولانا ہی کے الفاظ میں "۱۹۲۰ء میں حکیم صاحب مرحوم (مراد حکیم محمد اجمل خاں صاحب سے ہے) کے یہاں دہلی میں ہوئی۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان ۲۰ سال کی مدت ہوتی ہے۔ اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ اس طویل عرصے میں خط و کتابت بھی ہوئی ہو لیکن وقت کے اس فاصلے کے باوجود قلبی تعلق اسی طرح قائم رہا....

نواب صاحب اور مولانا آزاد کو ایک دوسرے سے جو گہرا قلبی تعلق تھا اس پر "کاروان خیال" اور "غبار خاطر" کے خطوط شاہد ہیں۔ یہ رنگ "کاروان خیال" کے خطوط میں اس لیے زیادہ گہرا ہے کہ وہ واقعی خطوط ہیں، خیالی مضامین نہیں ہیں، تاہم اس اعتبار سے "غبار خاطر" کی بھی بہت اہمیت ہے کہ اس مخاطبت کے لیے مولانا آزاد نے نواب صاحب ہی کا انتخاب فرمایا..... خود نواب صاحب کو بھی اس کا بہت

احساس تھا چنانچہ "غبار خاطر" کی وصول یابی پر مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں "اس عرصے میں دو نسخے غبار خاطر کے نور افزا ہوئے۔ غبار اور نور افزائی! ہاں نور افزائی! غبار تھا کوئے دوست کا۔ آنکھوں سے لگایا۔ پڑھا۔ پڑھوں گا زہے قسمت کہ گوشۂ تنہائی میں انیس صحبت حبیب رہا۔ بزم انس اس قدر طویل کہ ایک مجلہ کا سامان تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ واقعہ تاریخی واقعہ بنے گا۔" شکر نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو"۔ .....

۱۹۴۷ء میں مولانا آزاد مرکزی کابینہ میں وزیر تعلیم مقرر ہو گئے اور مستقل دہلی میں قیام ہو گیا۔ علی گڑھ سے دہلی دور نہیں تھی لیکن ایک طرف نواب صاحب کی صحت کمزور ہو گئی تھی اور دوسری طرف مولانا کی مصروفیات اور پریشانیاں روز افزوں تھیں اس لیے عرصہ تک ملاقات کی صورت نہیں نکل سکی۔ .....

(علی گڑھ میں) مولانا کی تشریف آوری ۱۹۴۹ء کے شروع میں ہوئی۔ ..... مولانا کا قیام تو اپنے سیلون میں ریلوے اسٹیشن پر رہا لیکن حبیب منزل میں تشریف آوری اور چائے نوشی ہوئی اور "پچھلی علمی و ادبی صحبتوں یگانہ روزگار ہستیوں اور کتابوں اور کتب خانوں کا ذکر ہوتا رہا"۔ اس کے بعد ان دونوں دوستوں کی ملاقات پھر کبھی نہیں ہو سکی تا آں کہ ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء کو نواب صدر یار جنگ نے رحلت فرمائی"۔

وہ خط کیسا جس میں نج کی باتیں نہ ہوں۔ جس میں جواب طلب امور

نہ ہوں اور جس میں کسی استفسار کا جواب نہ دیا گیا ہو اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو خط مکتوب الیہ کو پوسٹ نہ کیا گیا ہو، اسے خط کے زمرے میں کیوں کر شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ تو خط کے رنگ میں خود کلامی ہوئی، غالباً اسی لیے بعض نقادوں نے غبار خاطر کو انشائیوں کا مجموعہ کہا ہے۔ اگر انشائیے کی اصطلاح کو وسعت دی جائے تو بلا شبہ غبار خاطر کے خطوط اس صنف کے دائرے میں آجاتے ہیں مگر یہ نہ بھولنا چاہیے کہ مولانا کی یہ خود کلامی مخاطبت کے سارے آداب کی حامل ہے۔ دنیا میں روز ہی نج کے ایسے بہت سے خطوط بھی لکھے جاتے ہیں جو کسی نہ کسی سبب سے 'سپرد ڈاک' نہیں کیے جاتے۔ یہ سچ مچ قید خانے کی زائیدہ تنہائیوں کا غبار ہے جس نے مکاتیب کی صورت اختیار کر لی۔ تنہائیاں حظ کو بھی جنم دیتی ہیں اور کرب کو بھی۔ میں یہ تو نہیں مان سکتا کہ مولانا کے ان خطوط میں کرب نہیں ہے مگر ان کا کمال فن یہ ہے کہ انھوں نے کرب کو بھی حظ کے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ زندانی ادبیات کا اگر عمیق مطالعہ کیا جائے تو ان میں زیادہ تر کرب کا اظہار ہوا ہے (کرب سے میری مراد یاس اور قنوطیت نہیں ہے) اہل قلم نے کسی نہ کسی انداز میں استعارۃً یا کنایۃً قید خانے کے شب و روز کی شکایت ضرور کی ہے۔ غالب نے اپنے "حبسیہ" میں انانیت کے نشے میں سرشار ہوتے ہوئے بھی یہ کہا:

ہلہ وزدانِ گرفتار وفا نیست بشہر
خویشتن را بشما ہمدم و ہمراز کنم

لیکن مولانا سارے کرب کو پی گئے۔ اگر چند چھینٹے کہیں نظر آتے ہیں تو حظ کی رنگ آمیزی کے ساتھ۔

غبار خاطر کو جو حسن قبول ملا وہ ادب کی دنیا میں مکاتیب غالب سے اگر کم ہے تو بس اس حد تک جس کی تفسیر غالب نے خود کر دی ہے:

"وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے"۔

غبار خاطر کا شمار نصابی کتابوں میں بھی ہوتا ہے اس لیے اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ اتر پردیش اردو اکادمی کے اشاعتی منصوبوں میں کم قیمت پر نصابی کتابوں کی فراہمی بھی شامل ہے۔ اسے حسن اتفاق کہیے کہ اکادمی نے مولانا آزاد کی صد سالہ تقریبات کا جو پروگرام مرتب کیا ہے اس کا آغاز "انتخاب غبار خاطر" کی اشاعت سے ہو رہا ہے۔

محمود الٰہی
چیرمین، مجلس انتظامیہ

اتر پردیش اردو اکادمی
لکھنؤ۔ ۱۰ر جنوری ۱۹۸۸ء

مکتوبِ سری نگر

ہاؤس بوٹ۔ سری نگر۔

۲۴ر اگست ۱۹۴۵ء

گہے از دست، گاہے از دِل وگاہے زپا مانم
بہ سُرعت می روی اے عُمر! می ترسم کہ وا مانم

صدیقِ مُکرّم!

زِندگی کے بازار میں جنسِ مقاصد کی بہُت سی جُستجوئیں کی تھیں، لیکن اب ایک نئی متاع کی جُستجو میں مُبتلا ہو گیا ہُوں، یعنی اپنی کھوئی ہوئی تندرستی ڈھونڈھ رہا ہوں۔ مُعالجوں نے وادیِ کشمیر کی گُل گشتوں میں سُراغ رسانی کا مشورہ دِیا تھا، چنانچہ گُزشتہ ماہ کے اواخر میں گُل مرگ پہنچا اور تین ہفتہ تک مُقیم رہا۔ خیال تھا کہ یہاں کوئی سُراغ پا سکوں گا، مگر ہر چند جُستجو کی، متاعِ گُم گشتہ کا کوئی سُراغ نہیں مِلا۔

نِکل گئی ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے

آپ کو معلوم ہے کہ یہاں فیضی نے کبھی بارِ عیش کھولا تھا:

ہزار قافلۂ شوق می کشد شبگیر
کہ بارِ عیش کُشاید بہ خِطّۂ کشمیر

لیکن میرے حصّے میں ناخوشی وعلالت کا بار آیا۔ یہ بوجھ جس طرح کاندھوں پر اُٹھائے آیا تھا، اُسی طرح اُٹھائے واپس جا رہا ہُوں۔ خود زِندگی بھی سرتاسر ایک بوجھ ہی ہے، خوشی سے اُٹھائیں

یا ناخوشی سے، مگر جب تک بوجھ سر پڑتا ہے، اُٹھانا ہی پڑتا ہے۔

ما زندہ از انیم کہ آرام نگیریم

گُل مرگ سے سری نگر آگیا ہوں اور ایک ہاؤس بوٹ میں مُقیم ہوں، کل گُل مرگ سے روانہ ہو رہا تھا کہ ڈاک آئی اور اجمل خاں صاحب نے آپ کا مکتوب منظوم حوالہ کیا۔ کہ نہیں سکتا کہ اس پیامِ محبّت کو دلِ دردمند نے کن آنکھوں سے پڑھا اور کن کانوں سے سُنا۔ میرا اور آپ کا معاملہ تو وہ ہو گیا ہے جو غالبؔ نے کہا تھا۔

با چوں توئی معاملہ، بر خویش مِنّت است
از شِکوۂ تو شُکر گُزارِ خودیم ما

آپ نے اپنے تین شعروں کا پیامِ دِل نواز نہیں بھیجا ہے، لُطف و عنایت کا ایک پُورا دفتر کھول دیا ہے:

قلیل منک یکفینی و لکن
قلیلک لا یقال لہٗ قلیل

اِن سُطور کو آئندہ خامہ فرسائیوں کی تمہید تصوّر کیجیے۔ رہائی کے بعد جو کہانی سُنانی تھی، وہ ابھی تک نوکِ قلم سے آشنا نہ ہو سکی۔ والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ابوالکلام

مکتوبِ نسیم باغ

نسیم باغ۔ سری نگر

۳ر ستمبر ۱۹۴۵ء

از ما مپرس دردِ دلِ ما کہ یک زماں
خود را بحیلہ پیشِ تو خاموش کردہ ایم

صدیقِ مکرم!

وہی صبح چار بجے کا جاں فزا وقت ہے۔ ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں۔ دہنی طرف جھیل کی وسعت شالامار اور نشاط باغ تک پھیلی ہوئی ہے۔ بائیں طرف نسیم باغ کے چناروں کی قطاریں دور تک چلی گئی ہیں۔ چائے پی رہا ہوں اور آپ کی یاد تازہ کر رہا ہوں۔

گرچہ دوریم، بہ یادِ تو قدح می نوشیم
بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی

گرفتاری سے پہلے آخری خط جو آپ کے نام لکھ سکا تھا، وہ ۳ر اگست ۱۹۴۲ء کی صبح کا تھا۔ کلکتہ سے بمبئی جا رہا تھا۔ ریل میں خط لکھ کر رکھ لیا کہ بمبئی پہنچ کر اجمل خاں صاحب کے حوالے کروں گا، وہ نقل رکھ کر آپ کو بھیج دیں گے۔ آپ کو یاد ہوگا انھوں نے خطوط کی نقول رکھنے پر اصرار کیا تھا اور میں نے یہ طریقہ منظور کر لیا تھا، لیکن بمبئی پہنچتے ہی کاموں کے ہجوم میں اس طرح کھویا گیا کہ اجمل خاں صاحب کو خط دینا بھول گیا۔ ۹ر اگست کی صبح کو جب مجھے گرفتار کر کے احمد نگر لے جا رہے تھے، تو بعض کاغذات رکھنے کے لیے راہ میں اٹاچی کیس کھولا، اور یکایک وہ خط سامنے آگیا۔ اب دنیا سے تمام علاقے منقطع ہو چکے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ کوئی خط ڈاک میں ڈالا جا سکے۔ میں نے اسے اٹاچی کیس سے نکال کر مسوّدات کی فائل میں رکھ دیا اور فائل کو صندوق میں بند کر دیا۔

دو بجے ہم احمد نگر پہنچے اور پندرہ منٹ کے بعد قلعہ کے اندر محبوس تھے۔ اب اس دنیا

میں جو قلعہ سے باہر تھی اور اُس دُنیا میں جو قلعہ کے اندر تھی، برسوں کی مسافت حائل ہوگئی

کیف الوصول الیٰ سعاد و دونہا

قلل الجبال و بینھن حتوف

دُوسرے دِن یعنی ۱۰ر اگست کو حسبِ معمول صُبح تین بجے اُٹھا۔ چائے کا سامان جو سفر میں ساتھ رہتا ہے، وہاں بھی سامان کے ساتھ آگیا تھا۔ میں نے چائے دم دی۔ فنجان سامنے رکھا، اور اپنے خیالات میں ڈوب گیا۔ خیالات مُختلف میدانوں میں بھٹکنے لگے تھے۔ اچانک وہ خط جو ۳ر اگست کو ریل میں لکھا تھا، اور کاغذات میں پڑا تھا، یاد آگیا۔ بے اختیار جی چاہا کہ کُچھ دیر آپ کی مُخاطبت میں بسر کروں، اور آپ سُن رہے ہوں یا نہ سُن رہے ہوں مگر رُوئے سُخن آپ ہی کی طرف رہے، چنانچہ اِس عالم میں ایک مکتوب قلم بند ہوگیا، اور اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دِن مکتوب قلم بند ہوتے رہے۔ آگے چل کر بعض دیگر احباب واعزّہ کی یاد بھی سامنے آئی، اور اُن کی مُخاطبت میں بھی گاہ گاہ طبعِ واماندۂ حال درازنفسی کرتی رہی۔ قید خانہ سے باہر کی دُنیا سے اب سارے رِشتے کٹ چُکے تھے، اور مستقبل پردۂ غیب میں مستور تھا۔ کُچھ معلوم نہ تھا یہ مکتوب کبھی مکتوب الیہم تک پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں۔ تاہم ذوقِ مُخاطبت کی طلب گاریاں کُچھ اِس طرح دِلِ مُستمند پر چھا گئی تھیں کہ قلم اُٹھا لیتا تھا تو پھر رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ لوگوں نے نامہ بری کا کام کبھی قاصِد سے لیا، کبھی بالِ کبوتر سے، میرے حصّے میں عنقا آیا۔

ایں رسم و راہِ تازہ ز حرمانِ عہد ماست

عنقا بروزگار کسے نامہ بر نہ بود

۱۰ر اگست ۱۹۴۲ء سے مئی ۱۹۴۳ء تک اُن مکتوبات کی نگارش کا سلسلہ جاری رہا، لیکن اُس کے بعد رُک گیا، کیوں کہ ۹ر اپریل ۱۹۴۳ء کے حادثہ کے بعد طبعِ درماندۂ حال بھی رُک گئی تھی اور اپنی واماندگیوں میں گُم تھی۔ اگرچہ اُس کے بعد بھی بعض مُصنّفات کی تسوید و ترتیب کا کام بدستور جاری رہا، اور قلعۂ احمد نگر کے اور تمام معمولات بھی بغیر کسی تغیّر کے

جاری ہیں، تاہم یہ حقیقتِ حال چھپانی نہیں چاہتا کہ قرار و سکون کی یہ جو کچھ نمائش تھی، جسم وصورت کی تھی، قلب و باطن کی نہ تھی۔ جسم کو میں نے ہلنے سے بچا لیا تھا، مگر دل کو نہیں بچا سکا تھا۔

دلِ دیوانہ دارم کہ در صحراست پنداری

اُس کے بعد بھی گاہ گاہ حالات کی تحریک کام کرتی رہی اور رشتۂ فکر کی گرہیں کھلتی رہیں، مگر اب سلسلۂ کتابت کی وہ تیز رفتاری مفقود ہو چکی تھی جس نے اوائلِ حال میں طبیعت کا ساتھ دیا تھا۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں جب احمد نگر سے بانکوڑا میں قید تبدیل کر دی گئی تو طبیعت کی آمادگیوں نے آخری جواب دے دیا۔ صرف بعض مصنفات کی تکمیل کا کام جاری رکھا جا سکا۔ اور کسی تحریر و تسوید کے لیے طبیعت مستعد نہ ہوئی۔ آخری مکتوب جو بعض سیاسی مسائل کی نسبت ایک عزیز کے نام قلم بند ہوا ہے، ۳ مارچ ۱۹۴۵ء کا ہے۔ اُس مکتوب پر یہ داستانِ بے ستون و کوہکن ختم ہو جاتی ہے، اگرچہ زندگی کی داستان ابھی ختم نہیں ہوئی ہے:

شمّہ از داستانِ عشقِ شور انگیزِ ماست

ایں حکایتہا کہ از فرہاد و شیریں کردہ اند

غور کیجیے تو انسان کی زندگی اور اُس کے محسوسات کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ تین برس کی مدّت ہو یا تین دن کی، مگر جب گزرنے پر آتی ہے تو گزر ہی جاتی ہے۔ گزرنے سے پہلے سوچیے، تو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ پہاڑ سی مدّت کیوں کر کٹے گی؟ گزرنے کے بعد سوچیے تو تعجّب ہوتا ہے کہ جو کچھ گزر چکا، وہ چند لمحوں سے زیادہ نہ تھا۔

رہائی کے بعد جب کانگرس ورکنگ کمیٹی کی صدارت کے لیے کلکتہ سے بمبئی آیا، اور اُسی مکان اور اُسی کمرے میں ٹھہرا، جہاں تین برس پہلے اگست ۱۹۴۲ء میں ٹھہرا تھا، تو یقین کیجیے ایسا محسوس ہونے لگا تھا، جیسے ۹ اگست اور اُس کے بعد کا سارا ماجرا کل کی بات ہے، اور یہ پورا زمانہ ایک صبح شام سے زیادہ نہ تھا۔ حیران تھا کہ جو کچھ گزر چکا وہ خواب تھا، یا جو کچھ

گزر رہا ہے، یہ خواب ہے:

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

۱۵ر جون کو جب بانکوڑا میں رہا ہوا، تو تمام مکتوبات نکالے، اور ایک فائل میں بہ ترتیب تاریخ جمع کر دیے۔ خیال تھا کہ انھیں حسبِ معمول نقل کرنے کے لیے دے دوں گا، اور پھر اصل آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا، لیکن جب مولوی اجمل خاں صاحب کو اُن کی موجودگی کا علم ہوا تو وہ بہت مُصر ہوئے کہ انھیں بلا تاخیر اشاعت کے لیے دے دینا چاہیے۔ چنانچہ ایک خوش نویس کو شملہ بلایا گیا، اور پورا مجموعہ کتابت کے لیے دے دیا گیا۔ اب کتابت ہو رہی ہے اور اُمید ہے کہ عنقریب طباعت کے لیے پریس کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ اب میں اُن مکتوبات کو قلمی مکتوبات کی صورت میں نہیں بھیجوں گا۔ مطبوعہ مجموعے کی صورت میں پیش کروں گا۔

شملہ میں 'اخبار مدینہ' بجنور کے ایڈیٹر صاحب آئے تھے، اُنھوں نے مولوی اجمل خاں صاحب سے اس سلسلہ کے پہلے مکتوب کی نقل لے لی تھی۔ وہ اخبارات میں شائع ہو گیا ہے۔ شاید آپ کی نظر سے گزرا ہو، 'صدیق مکرم' کے تخاطب سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ روئے سخن آپ ہی کی طرف تھا۔

چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود

مکتوبات کے دو حصے کر دیے ہیں؛ غیر سیاسی اور سیاسی۔ یہ مجموعہ صرف غیر سیاسی مکاتیب پر مشتمل ہے۔ اس کے تمام مکاتیب بلا استثنا آپ کے نام لکھے گئے ہیں۔

پرسوں دہلی کا قصد ہے۔ چوں کہ امریکن فوج کے جنرل مقیم دہلی نے از راہِ عنایت اپنے خاص ہوائی جہاز کے یہاں بھیجنے کا انتظام کر دیا ہے، اس لیے موٹر کار کے تکلیف دہ سفر سے بچ جاؤں گا اور ڈھائی گھنٹے میں دہلی پہنچ جاؤں گا۔ وہاں عید کی نماز پڑھ کر بمبئی کے لیے روانہ ہونا ہے۔ ۱۰ر سے ۲۴ر تک بمبئی میں قیام رہے گا۔

ابوالکلام

مکتوبِ سفر

جو ۹ر اگست کی گرفتاری کی وجہ سے بھیجا نہ جا سکا، اور جس کی طرف احمد نگر کے پہلے مکتوب میں اِشارہ کیا گیا ہے۔

بمبئی میل (بہ راہ ناگ پور)

۳ر اگست ۱۹۴۲ء

صدیقِ مُکرّم!

دہلی اور لاہور میں اِنفلوئنزا کی شِدّت نے بہُت خستہ کر دیا تھا۔ ابھی تک اُس کا اثر باقی ہے۔ سر کی گرانی کسی طرح کم ہونے پر نہیں آتی۔ حیران ہوں اِس وبالِ دوش سے کیوں کر سُبک دوش ہوں۔ دیکھیے، 'وبال دوش' کی ترکیب نے غالبؔ کی یاد تازہ کر دی۔

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خُدا! کوئی دیوار بھی نہیں

۲۹ر جولائی کو اِس وبال کے ساتھ کلکتہ واپس ہُوا تھا۔ چار دِن بھی نہیں گزرے کہ کل ۲ر اگست کو بمبئی کے لیے نِکلنا پڑا۔ جو وبال ساتھ لایا تھا، اب پھر اپنے ساتھ واپس لے جا رہا ہوں۔

رَو میں ہے رخشِ عُمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

مگر دیکھیے۔ صُبح چار بجے کے وقتِ گراں مایہ کی کرشمہ سازیوں کا بھی کیا حال ہے۔ قِیام کی حالت ہو یا سفر کی، ناخوشی کی کُلفتیں ہوں یا دِل آشوبی کی کاہشیں، جِسم کی ناتوانیاں ہوں یا دِل و دِماغ کی افسُردگیاں، کوئی حالت ہو، لیکن اِس وقت کی مسیحائیاں اُفتادگانِ بسترِ الم

سے کبھی تغافل نہیں کر سکتیں۔

فیضے عجبے یافتم از صبح ببینید
ایں جادۂ روشن رہِ مے خانہ نہ باشد

مَیں ایک کوپے میں سفر کر رہا ہوں۔ اِس میں چار کھڑکیاں ہیں، دو بند تھیں، دو کھلی تھیں۔ مَیں نے صبح اُٹھتے ہی دو بند بھی کھول دیں۔ اب ریل کی رفتار جتنی گرم ہوتی جاتی ہے، اُتنی ہی ہوا کے جھونکوں کی خنکی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ جس بستر کرب پر ناخوشی[1] کی کلفتوں نے گرا دیا تھا اِسی پر نسیمِ صبح گاہی کی چارہ فرمائیوں نے اب اُٹھا کر بٹھا دیا ہے۔ شاید کسی ایسی ہی رات کی صبح ہوگی جب خواجۂ شیراز کی زبان سے بے اختیار نکل گیا تھا:

خوشش بادا نسیمِ صبح گاہی
کہ دردِ شب نشیناں را دوا کرد

ٹرین آج کل کے معمول کے مطابق بے وقت جا رہی ہے۔ جس منزل سے اِس وقت تک گزر جانا تھا، ابھی تک اُس کا کوئی سُراغ دِکھائی نہیں دیتا۔ سوچتا ہوں تو اِس معاملۂ خاص میں وقت کے معاملۂ عام کی پوری تصویر نمایاں ہو رہی ہے:

کس نمی گویدم از منزلِ آخر خبرے
صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش ست

رات ایک ایسی حالت میں کٹی، جسے نہ تو اِضطراب سے تعبیر کر سکتا ہوں نہ سکون سے، آنکھ لگ جاتی تھی تو سکون تھا۔ کھل جاتی تھی تو اِضطراب تھا۔ گویا ساری رات دو متضاد خوابوں کے دیکھنے میں بسر ہو گئی، ایک تعمیر کی نقش آرائی کرتا تھا تو دوسرا تخریب کی برہم زنی:

---

[1] یہاں "ناخوشی" سے محض خوشی کی نفی مقصود نہیں ہے بلکہ فارسی کا "ناخوشی" مقصود ہے۔ فارسی میں بیماری کو ناخوشی کہتے ہیں۔

بیداریِ میانِ دو خواب ست زندگی
گردِ تخیّلِ دو سراب ست زندگی
از لُطفِ دو موج حبابے دمیدہ است
یعنی طلسمِ نقش بر آب ست زندگی

تین بج کر چند منٹ گزرے تھے کہ آنکھ کھل گئی۔ صبح کی چائے کے لیے سفر میں یہ معمول رہتا ہے رات کو عبداللہ اسپرٹ کا چولھا اور پانی کی کیتلی، پانی بہ مقدارِ مطلوب سے بھری ہوئی، ٹیبل پر رکھ دیتا ہے، چائے دانی اُس کے پہلو میں جگہ پاتی ہے کہ بہ حکم وضع الشیئ فی محلہٖ یہی اُس کا محلِ صحیح ہونا چاہیے، مگر فنجان اور شکر دانی کے لیے اُس کا قرب ضروری نہ ہوا کہ وضع الشیئ فی غیر محلہٖ میں داخل ہو جاتا۔ اگر صبح تین بجے سے چار بجے کے اندر کوئی اسٹیشن آجاتا ہے تو اکثر حالتوں میں عبداللہ آکر چائے دم دے دیتا ہے۔ نہیں آیا تو پھر مجھے خود ہی اپنے دستِ شوق کی کامجویانہ سرگرمیاں کام میں لانی پڑتی ہیں۔ "اکثر حالتوں" کی قید اس لیے لگانی پڑی کہ تمام کلیوں کی طرح یہ کلیہ بھی مستثنیات سے خالی نہیں ہے۔ بعض حالتوں میں گاڑی اسٹیشن پر رک بھی جاتی ہے، مگر عبداللہ کی صورت نظر نہیں آتی۔ پھر جب نظر آتی ہے تو اُس کی معذرتیں میری فکرِ کاوش آشنا کے لیے ایک دوسرا ہی مسئلہ پیدا کر دیتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نسیمِ صبح گاہی کا ایک ہی عمل دو مختلف طبیعتوں کے لیے دو متضاد نتیجوں کا باعث ہو جاتا ہے۔ اُس کی آمد مجھے بیدار کر دیتی ہے، عبداللہ کو اور زیادہ سُلا دیتی ہے۔ الارم کی ٹائم پیس بھی اُس کے ہرھانے رہنے لگی، پھر بھی نتائج کا اوسط تقریباً یکساں ہی رہا۔ معلوم نہیں آپ اس اشکال کا کیا حل تجویز کریں گے، مگر مجھے شیخ شیراز کا بتلایا ہوا حل مل گیا ہے، اور اُس پر مطمئن ہو چکا ہوں۔

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ رُوید و در شور بوم خس

بہر حال چائے کا سامان حسب معمول مرتب اور آمادہ تھا۔ نہیں معلوم آج اسٹیشن پر آئے؟

اور آئے بھی تو اِس کا اِطمینان کیوں کر ہو کہ عبداللہ کی آمد کا قاعدۂ کلیہ آج ہی بہ حالت اِستثناء نمودار نہ ہوگا۔ میں نے دِیا سلائی اُٹھائی اور چولھا روشن کر دیا۔ اب چائے پی رہا ہوں اور آپ کی یاد تازہ کر رہا ہوں۔ مقصود اس تمام دراز نفسی سے اِس کے سوا کچھ نہیں کہ مخاطبت کے لیے تقریب سخن ہاتھ آئے:

نفسے بہ یاد تو می زنم، چہ عبارت و چہ معانیم

چائے بہت لطیف ہے۔ چین کی بہترین قسموں میں سے ہے۔ رنگ اِس قدر ہلکا کہ واہمہ پر اُس کی ہستی مشتبہ ہو جائے۔ گویا ابو نواس والی بات ہوئی کہ:

رقت الزجاج و رقت الخمر

فتشابها فتشاكل الأمر

کیف اِس قدر تند کہ بلا مبالغہ اُس کا ہر فنجان قاآنی کے رطلِ گراں کی یاد تازہ کر دے:

ساقی بدہ رطلِ گراں، زاں مے کہ دہقاں پرورد

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ چائے کے باب میں میرے بعض اختیارات ہیں۔ میں نے چائے کی لطافت و شیرینی کو تمباکو کی تندی و تلخی سے ترکیب دے کر ایک کیفِ مرکب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی متصلاً ایک سگریٹ بھی سلگا لیا کرتا ہوں، پھر اِس ترکیبِ خاص کا نقشِ عمل یوں جماتا ہوں کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد چائے کا ایک گھونٹ لوں گا اور متصلاً سگریٹ کا بھی ایک کش لیتا رہوں گا۔ علمی اِصطلاح میں اِس صورتحال کو علیٰ سبیل التوالی والتعاقب کہیے۔ اِس طرح اِس سلسلۂ عمل کی ہر کڑی چائے کے ایک گھونٹ اور سگریٹ کے ایک کش کے باہمی اِمتزاج سے بتدریج ڈھلتی جاتی ہے، اور سلسلۂ کار دراز ہوتا رہتا ہے۔ مقدار کے حُسنِ تناسب کا اِنضباط مُلاحظہ ہو کہ اِدھر فنجان آخری جُرعہ سے خالی ہُوا، اُدھر تمباکوے آتش زدہ نے سگریٹ کے آخری خطِ کشید تک پہنچ کر دم لیا۔ کیا کہوں، اِن دو اجزائے تند و لطیف کی آمیزش سے کیف و سرور کا کیسا معتدل مزاج ترکیب پذیر ہو گیا ہے۔ جی چاہتا ہے فیضی کے الفاظ مستعار لوں:

اعتدالِ معانی از من پُرس
کہ مزاجِ سخن شناختہ ام

آپ کہیں گے، چائے کی عادت بجائے خود ایک عِلّت تھی، اُس پر مزید عِلّت ہائے نافرجام کا اِضافہ کیوں کیا جائے؟ اِس طرح کے مُعاملات میں اِمتزاج و ترکیب کا طریقہ کام میں لانا، عِلّتوں پر عِلّتیں بڑھانا، گویا حِکایتِ بادہ و تریاک کو تازہ کرنا ہے۔ میں تسلیم کروں گا کہ یہ تمام خود ساختہ عادتیں بلاشُبہ زِندگی کی غلطیوں میں داخل ہیں، لیکن کیا کہوں؟ جب کبھی معاملہ کے اِس پہلو پر غور کیا، طبیعت اِس پر مُطمئن نہ ہو سکی کہ زِندگی کو غلطیوں سے یکسر معصوم بنا دیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِس روزگارِ خراب میں زِندگی کو زِندگی بنائے رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ غلطیاں ضرور کرنی چاہئیں:

پیرِ ما گفت، خطا در قلمِ صُنع نہ رفت
آفریں بر نظرِ پاکِ خطاپوشش باد

غور کیجیے، وہ زِندگی ہی کیا ہوئی، جس کے دامنِ خُشک کو کوئی غلطی تر نہ کر سکے۔ وہ چال ہی کیا جو لڑکھڑاہٹ سے یکسر معصوم ہو:

تو و قطعِ منازِلہا، من و یک لغزش پائے

اور اگر پھر غور و فکر کا ایک قدم اور آگے بڑھائیے، تو سارا معاملہ بالآخر وہیں ختم ہو جائے گا، جہاں کبھی عارفِ شیراز نے اُسے دیکھا تھا:

بیا کہ رونقِ ایں کارخانہ کم نہ شود
ز زہد، ہمچو توئی یا بہ فسق ہم چو منی

اور اگر پوچھیے کہ کامرانیِ عمل کا معیار کیا ہُوا، اگر یہ آلودگیاں راہ میں مخل نہ سمجھی گئیں؟ تو اِس کا جواب وہی ہے جو عُرفائے طریق نے ہمیشہ دیا ہے:

ترکِ ہمہ گیر و آشنائے ہمہ باش

یعنی ترک و اختیار دونوں کا نقشِ عمل اِس طرح ایک ساتھ بٹھائیے کہ آلودگیاں دامن تر کریں

مگر دامن پکڑ نہ سکیں۔ اِس راہ میں کانٹوں سے اُلجھنا مُخل نہیں ہوتا، دامن گیر ہونا مُخل ہوتا ہے۔ کچھ ضروری نہیں کہ آپ اِس ڈر سے ہمیشہ اپنا دامن سمیٹے رہیں کہ کہیں بھیگ نہ جائے۔ بھیگتا ہے تو بھیگنے دیجیے، لیکن آپ کے دست و بازو میں یہ طاقت ضرور ہونی چاہیے کہ جب چاہا اِس طرح نچوڑ کے رکھ دیا کہ آلودگی کی ایک بوند بھی باقی نہ رہی:

تر دامنی پہ شیخ! ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

یہاں کامرانی سود و زیاں کی کاوش میں نہیں ہے، بلکہ سود و زیاں سے آسودہ حال رہنے میں ہے۔ نہ تو تر دامنی کی گرانی محسوس کیجیے، نہ خشک دامنی کی سُبک سری، نہ آلودہ دامنی پر پریشان حالی ہو، نہ پاک دامنی پر سرگرانی:

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در اقلیمِ عشق
رُوے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست

آپ کو ایک واقعہ سناؤں۔ شاید رشتۂ سخن کی ایک گرہ اس سے کھل جائے۔ ۱۹۲۱ء میں جب مجھے گرفتار کیا گیا، تو مجھے معلوم تھا کہ قید خانہ میں تمباکو کے اِستعمال کی اِجازت نہیں۔ مکان سے جب چلنے لگا تو ٹیبل پر سگریٹ کیس دھرا تھا۔ عادت کے زیرِ اثر پہلے ہاتھ بڑھا کہ اُسے جیب میں رکھ لوں، پھر صورتِ حال کا اِحساس ہُوا تو رُک گیا۔ لیکن پولس کمشنر نے، جو گرفتاری کا وارنٹ لے کر آیا تھا، بہ اِصرار کہا کہ ضرور جیب میں رکھ لو۔ میں نے رکھ لیا۔ اُس میں دس سگریٹ تھے۔ ایک پولیس کمشنر کے آفس میں پیا، دوسرا راستہ میں سُلگایا، دو ساتھیوں کو پیش کیے۔ باقی چھ رہ گئے تھے کہ پریسیڈنسی جیل علی پور پہنچا۔ جیل کے دفتر سے جب اندر جانے لگا، تو خیال ہوا، اِس جیب کے وبال سے سُبک جیب ہو کر اندر قدم رکھوں تو بہتر ہے۔ میں نے کیس نکالا اور مع سگرٹوں کے جیلر کی نذر کر دیا۔ اور پھر اُس دن سے لے کر دو برس تک سگریٹ کے ذائقہ سے کام و دہن آشنا نہیں ہُوا۔ ساتھیوں میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی، جن کے پاس سگریٹ کے ذخیرے موجود رہتے تھے، اور قید خانہ کا اِحتساب، عمداً چشم پوشی کرتا تھا، بعض

شرب[1] الیہود" کا طریقہ کام میں لاتے تھے۔

شربُ الیہود کرتے ہیں نصرانیوں میں ہم

بعضوں کی جرأتِ رندانہ اِس قید و بند کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ:

ولا تسقنی سرا، فقد امکن الجھر

پر عمل کرتے تھے۔ مجھے یہ حال معلوم تھا مگر اپنی توبۂ اضطرار پر کبھی پشیمان نہیں ہُوا۔ کئی مرتبہ گھر سے سگریٹ کے ڈبے آئے اور مَیں نے دوسروں کے حوالے کر دیے:

خوشم کہ توبۂ من نرخِ بادہ ارزاں کرد

سرگذشت کا اصلی واقعہ اب سُنیے۔ جس دِن علی الصّباح مجھے رہا کیا گیا، تو قید خانہ کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ نے اپنا سگریٹ کیس نکالا، اور ازراہِ تواضع مجھے بھی پیش کیا۔ یقین کیجیے، جس درجہ کے عزم کے ساتھ دو سال پہلے سگریٹ ترک کیا تھا، اُتنے ہی درجہ کی آمادگی کے ساتھ یہ پیش کش قبول کر لی۔ نہ ترک میں دیر لگی تھی، نہ اب اختیار میں جھجک ہوئی۔ نہ محرومی پر ماتم ہُوا تھا، نہ حصول پر نشاط۔ ترک کی تلخ کامی نے جو مزا دیا تھا، وہی اب اختیار کی حلاوت میں محسوس ہونے لگا تھا:

حریفِ صافیِ دوری نہ، خطا ایں جاست

تمیزِ ناخوش و خوش می کنی، بلا ایں جاست

---

[1] اِسلامی حکومتوں میں یہودی پوشیدہ شراب بناتے تھے اور بیچتے تھے، اِس لیے پوشیدہ شراب پینے کے معنی میں "شربُ الیہود" کی اِصطلاح رائج ہو گئی۔

[2] پورا شعر یہ ہے:

الا فاسقنی خمرا، وقل لی ھی الخمر ولا تسقنی سرًا، فقد امکن الجھر

مجھے شراب پلا، اور یہ کہہ کر پلا کہ یہ شراب ہے۔ مجھے چھپا کر نہ پلا، کیوں کہ اب کھل کر پینا ممکن ہو گیا ہے۔

۱۹۲۱ء کے بعد پھر تین مرتبہ قید و بند کا مرحلہ پیش آیا، لیکن ترک کی ضرورت پیش نہ آئی، کیوں کہ سگریٹ کے ڈبے میرے سامان کے ساتھ گئے۔ وہ دیکھے گئے مگر روکے نہیں گئے۔ اگر روکے جاتے تو پھر ترک کر دیتا۔

اب قلم کی سیاہی جواب دینے لگی ہے، اس لیے رک جاتا ہوں:

قلم ایں جا رسید و سر بشکست

ابوالکلام

داستان بے ستون و کوہ کن

قلعۂ احمد نگر

۱۰ر اگست ۱۹۴۲ء

از ساز و برگِ قافلۂ بے خوداں مپرس !
بے نالہ می رود جرسِ کاروانِ ما !

صدیقِ مکرم

کل صبح تک وسعت آبادِ بمبئی میں فرصتِ تنگ حوصلہ کی بے مائگی کا یہ حال تھا کہ ۳ر اگست کا لکھا ہوا مکتوبِ سفر بھی اجمل خان صاحب کے حوالہ نہ کر سکا کہ آپ کو بھیج دیں۔ لیکن آج قلعۂ احمد نگر کے حصارِ تنگ میں اُس کے حوصلۂ فراخ کی آسودگیاں دیکھیے کہ جی چاہتا ہے، دفتر کے دفتر سیاہ کر دوں۔

وسعتے پیدا کن اے صحرا کہ امشب در غمش
لشکرِ آہِ من از دل خیمہ بیروں می زند

نو مہینے ہو گئے ۴ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو نینی کے مرکزی قید خانہ کا دروازہ میرے لیے کھولا گیا تھا۔ کل ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کو سوا دو بجے قلعۂ احمد نگر کے حصارِ کہنہ کا نیا پھاٹک میرے پیچھے بند کر دیا گیا۔ اس کارخانۂ ہزار شیوہ و رنگ میں کتنے ہی دروازے کھولے جاتے ہیں تاکہ بند ہوں، اور کتنے ہی بند کیے جاتے ہیں تاکہ کھلیں۔ نو ماہ کی مدت بظاہر کوئی بڑی مدت نہیں معلوم ہوتی۔

دو کروٹیں ہیں عالمِ غفلت میں خواب کی

لیکن سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تاریخ کی ایک پوری داستان گذر چکی:

چوں صفحہ تمام شد، ورق برگردد

نئی داستان جو شروع ہو رہی ہے، معلوم نہیں مستقبل اسے کب اور کس طرح ختم کرے گا!

فریب جہاں قصۂ روشن است

بہ بیں تا چہ زاید شب آبستن ست

۴ اگست کو بمبئی پہنچا، تو انفلوئنزا کی حرارت اور سر کی گرانی کا اضمحلال بھی میرے ساتھ تھا۔ تاہم پہنچتے ہی کاموں میں مشغول ہو جانا پڑا۔ طبیعت کتنی ہی بے کیف ہو لیکن گوارا نہیں کرتی کہ اوقات کے مقررہ نظام میں خلل پڑے۔ ۴ سے ۷ اگست تک ورکنگ کمیٹی کے اجلاس ہوتے رہے، کی دوپہر سے آل انڈیا کمیٹی شروع ہوئی۔ معاملات کی رفتار ایسی تھی کہ کارروائی تین دن تک پھیل سکتی تھی اور مقامی کمیٹی نے تین ہی دن کا انتظام بھی کیا تھا، لیکن میں نے کوشش کی کہ دو دن سے زیادہ بڑھنے نہ پائے۔ ۸ کو دو بجے سے رات کے ۱۱ بجے تک بیٹھنا پڑا، لیکن کارروائی ختم کر کے اٹھا۔

کام تھے عشق میں بہت پر میر

ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

تھکا ماندہ قیام گاہ پر پہنچا تو صاحب مکان کو منتظر اور کسی قدر متفکر پایا۔ یہ صاحب کچھ عرصہ سے بیمار ہیں اور ایک طرح کی دماغی الجھن میں مبتلا رہتے ہیں۔ میں ان سے وقت کے معاملات کا تذکرہ بچا جاتا تھا، تاکہ ان کی دماغی الجھن اور زیادہ نہ بڑھ جائے۔ وہ ورکنگ کمیٹی کی ممبری سے بھی مستعفی ہو چکے ہیں اور اگرچہ میں نے ابھی تک ان کا استعفا منظور بھی نہیں کیا ہے لیکن انھیں کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کے لیے کہا بھی نہیں۔ وہ کہنے لگے فلاں شخص شام کو آیا تھا۔ کئی گھنٹے منتظر رہ کر ابھی ابھی گیا ہے اور یہ پیام دے گیا ہے کہ گرفتاری کی افواہیں غلط نہ تھیں۔ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ تمام انتظامات کر لیے گئے ہیں آج رات کسی وقت یہ معاملہ ضرور پیش آئے گا۔ دو ہفتے سے گرفتاری کی افواہیں دہلی سے

کلکتہ تک ہر شخص کی زبان پر تھیں۔ میں سنتے سنتے تھک گیا تھا!

یا وفا، یا خبرِ وصلِ تو، یا مرگِ رقیب
بازیِ چرخ ازیں یک دو سہ کارے بکند

اور کچھ اس بات کا بھی خیال تھا کہ اُن کی ماؤف طبیعت کو اس طرح کی فکروں سے پریشان نہ ہونے دوں۔ میں نے جھنجھلا کر کہا: "جس طرح کے حالات درپیش ہیں۔ ان میں اس طرح کی افواہیں ہمیشہ اڑا ہی کرتی ہیں۔ ایسی خبروں کا اعتبار کیا! اور پھر اگر واقعی ایسا ہی ہونے والا ہے تو ان باتوں میں وقت خراب کیوں کریں؟ مجھے جلد کچھ کھا کر سو جانے دیجئے کہ آدھی رات جواب باقی رہ گئی ہے، ہاتھ سے نہ جائے، اور چند گھنٹے آرام کر لوں۔"

گر غم خوریم خوش نہ بود، بہ کہ مے خوریم!

حسبِ معمول چار بجے اٹھا، لیکن طبیعت تھکی ہوئی اور سر میں سخت گرانی تھی۔ میں نے جن اسپرین (Genasprin) کی دو گولیاں منہ میں ڈال کر چائے پی اور قلم اٹھایا کہ بعض ضروری خطوط کا مسودہ لکھ لوں جو رات کی تجویز کے ساتھ پریسیڈنٹ روزویلٹ وغیرہ کو بھیجنا طے پایا تھا۔ سامنے سمندر میں بھاٹا ختم ہو چکا تھا، اور اس کے ختم ہوتے ہی رات بھر کی اُمس بھی ختم ہو گئی تھی۔ اب جوار کی لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں، اور ہوا کے ٹھنڈے اور نم آلود جھونکے بھیجنے لگی تھیں۔ کچھ تو جن اسپرین نے کام کیا ہوگا، کچھ نسیمِ صبحگاہی کے ان شفا بخش جھونکوں نے چارہ فرمائی کی۔ ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے سر کی گرانی کم ہو رہی ہے۔ پھر افاقہ کے اس احساس نے اچانک غنودگی کی سی حالت طاری کر دی:

نسیمِ صبح! تیری مہربانی!

بے اختیار ہو کر قلم رکھ دیا اور بستر پر لیٹ گیا، لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ پھر اچانک ایسا محسوس ہوا، جیسے سڑک پر سے موٹر کاریں گزر رہی ہوں۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ کئی کاریں مکان کے احاطے میں داخل ہو گئی ہیں اور اس بنگلے کی طرف جا رہی ہیں جو مکان

کے پچھواڑے میں واقع ہے، اور جس میں صاحب مکان کا لڑکا دھیرو رہتا ہے۔ پھر خیال ہوا میں خواب دیکھ رہا ہوں، اور اس کے بعد گہری نیند میں ڈوب گیا:

زہے مراتب خوابے کہ بہ ز بیداری ست!

شاید اس حالت پر دس بارہ منٹ گزرے ہوں گے کہ کسی نے میرا پیر دبایا۔ آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں۔ دھیرو ایک کاغذ ہاتھ میں لیے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے، "دو فوجی افسر ڈپٹی کمشنر پولیس کے ساتھ آئے ہیں اور یہ کاغذ لائے ہیں۔" گو اتنی ہی خبر میرے لیے کافی تھی مگر میں نے کاغذ لے لیا کہ دیکھوں:

کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی!

میں نے دھیرو سے کہا: مجھے ڈیڑھ گھنٹہ تیاری میں لگے گا۔ اُن سے کہہ دو کہ انتظار کریں پھر غسل کیا کپڑے پہنے، چند ضروری خطوط لکھے، اور باہر نکلا تو پانچ بج کر پینتالیس منٹ ہوئے تھے:

کار مشکل بود ما بر خویش آساں کردہ ایم!

کار باہر نکلی، تو صبح مسکرا رہی تھی۔ سامنے دیکھا تو سمندر اُچھل اُچھل کر ناچ رہا تھا۔ نسیم صبح کے جھونکے احاطے کی روشنی میں پھرتے ہوئے ملے، یہ پھولوں کی خوشبو چن چن کر جمع کر رہے تھے اور سمندر کو بھیج رہے تھے کہ اپنی ٹھوکروں سے فضا میں پھیلا تا رہے۔ ایک جھونکا کار میں سے ہو کر گزرا تو بے اختیار حافظ کی غزل یاد آگئی:

صبا وقتِ سحر بوئے ز زلفِ یار می آورد
دلِ شوریدۂ ما را ز نو در کار می آورد!

کار دکٹوریہ ٹرمینس اسٹیشن پر پہنچی، تو اس کا پچھلا حصہ ہر طرف سے فوجی پہرہ کے حصار میں تھا، اور اگرچہ لوکل ٹرینوں کی روانگی کا وقت گذر رہا تھا۔ لیکن مسافروں کا داخلہ روک دیا گیا تھا۔ صرف ایک پلیٹ فارم پر کچھ ہلچل دکھائی دیتی تھی کیونکہ ایک انجن رسٹورنٹ کار کو ڈھکیل ڈھکیل کر ایک ٹرین سے جوڑ رہا تھا۔ معلوم ہوا۔ یہی کاروان خاص ہے،

جو ہم زندانیوں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ گاڑیاں کوریڈر کیریج (corridor carriage) قسم کی لگائی گئی تھیں جو آپس میں جڑ جاتی ہیں اور آدمی ایک سرے سے دوسرے سرے تک اندر ہی اندر چلا جاتا ہے۔ ٹرین کے اندر گیا تو معلوم ہوا، گرفتاریوں کا معاملہ پوری وسعت کے ساتھ عمل میں لایا گیا ہے۔ بہت سے آچکے ہیں، جو نہیں آئے وہ آتے جاتے ہیں:

بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

بعض احباب جو مجھ سے پہلے پہنچائے جا چکے تھے، ان کے چہروں پر بے خوابی اور ناوقت کی بیداری بول رہی تھی۔ کوئی کہتا تھا، رات دو بجے سویا اور چار بجے اٹھا دیا گیا۔ کوئی کہتا تھا، بمشکل ایک گھنٹہ نیند کا ملا ہوگا۔ میں نے کہا، معلوم نہیں، سوئی ہوئی قسمت کا کیا حال ہے اسے بھی کوئی جگانے کے لیے پہنچا یا نہیں؟

درازیِ شب و بیداریِ من، ایں ہمہ نیست
زبختِ من خبر آرید تا کجا خفتست!

بہر حال وقت کی گرمجوشیوں میں یہ شکایتیں مخل نہیں ہو سکتی تھیں۔ چونکہ ریسٹورنٹ کار لگ چکی تھی اور چاے کے لیے پوچھا گیا تھا، اس لیے گو پی چکا تھا، لیکن پھر منگوائی اور ان نیند کے متوالوں کو دعوت دی کہ اس جامِ صبحگاہی سے بادۂ دوشینہ کا خمار مٹائیں:

بنوش مے چو سبک رُوحی، اے حریف! مُدام
علی الخصوص دریں دم کہ سرگراں داری

یہاں "بادۂ دوشینہ" کی ترکیب محض "جامِ صبحگاہی" کی مناسبت سے زبانِ قلم پر طاری ہو گئی مگر غور کیجیے، کتنی مطابق حال واقع ہوئی ہے! صرف ایک شام اور صبح کے اندر صورت حال کیسی منقلب ہو گئی! کل شام کو جو بزم کیف و سرور آراستہ ہوئی تھی، اس کی بادہ گساریوں اور سیہ مستیوں نے دو پہر رات تک طول کھینچا تھا۔ لیکن اب صبح کے وقت دیکھیے تو!

نے وہ سُرور و سُور، نہ جوش و خروش ہے!

رات کی تر دماغیوں کی جگہ صبح کی سرگرانیوں نے لے لی، اور مجلس دوشین کی دست افشانیوں اور پاکوبیوں کے بعد جب آنکھ کھلی تو اب صبح خمار کی افسردہ جماہیوں کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا تھا:

خمیازہ رنج تہمت عیش رمیدہ ام
مے آں قدر نہ بود کہ رنج خمار برد

رات کی کیفیتیں جتنی تند و تیز ہوتی ہیں، صبح کا خمار بھی اتنا ہی سخت ہوتا ہے۔ اگر رات کی سیہ مستیوں کے بعد اب صبح خمار کی تلخ کامیوں سے سابقہ پڑا تھا، تو ایسا ہونا ناگزیر تھا، اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم شکوہ سنج ہوتے۔ البتہ حسرت اس کی رہ گئی کہ جب ہونا یہی تھا، تو کاش، جی کی ہوس تو پوری نکال لی ہوتی، اور نپے تلے پیمانوں کی جگہ شیشوں کے شیشے لنڈھا دیے ہوتے! خواجہ میر درد کیا خوب کہہ گئے ہیں:

کبھی خوش بھی کیا ہے جی کسی رند شرابی کا
بھرا دے منھ سے منھ ساقی! ہمارا اور گلابی کا

ساڑھے سات بج چکے تھے کہ ٹرین نے کوچ کی سیٹی بجائی۔ حافظ کی مشہور غزل کا یہ شعر کم از کم سینکڑوں مرتبہ تو پڑھا اور سنا ہوگا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کا اصلی لطف اسی وقت آیا:

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے مے آید

بمبئی میں جو افواہیں گرفتاری سے پہلے پھیلی ہوئی تھیں، ان میں احمد نگر کے قلعہ اور پونا کے آغا خان پیلس کا نام تعین کے ساتھ لیا جا رہا تھا جب کلیان اسٹیشن سے ٹرین آگے بڑھی، اور پونا کی راہ اختیار کی، تو سب کو خیال ہوا غالباً منزل مقصود پونا ہی ہے، لیکن جب پونا قریب آیا تو ایک غیر آباد اسٹیشن پر صرف بعض رفقا اتار لیے گئے، اور بمبئی کے مقامی قافلے کو بھی اترنے کے لیے کہا گیا مگر ہم سے کچھ نہیں کہا گیا، اور صدائے جرس نے پھر کوچ کا اعلان کر دیا:

جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

اب احمد نگر ہر شخص کی زبان پر تھا، کیوں کہ اگر پونا میں ہم نہیں اتارے گئے، تو پھر اس رخ پر احمد نگر کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ ایک صاحب نے جو انہی اطراف کے رہنے والے ہیں بتلایا کہ پونا اور احمد نگر کا باہمی فاصلہ ستر اسی میل سے زیادہ نہیں، اس لیے زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی گھنٹے کا سفر اور سمجھنا چاہیے۔ مگر میرا خیال دوسری ہی طرف جا رہا تھا: احمد نگر یقیناً دور نہیں ہے، بہت جلد آ جائے گا۔ مگر احمد نگر پر سفر ختم کب ہوتا ہے، احمد نگر سے تو شروع ہوگا۔ بے اختیار ابو العلاء معری کا لامیہ یاد آ گیا:

فیادارھا بالخیف ، اِنّ مزارھا
قریبٌ، ولکن دُون ذالک اَھوالُ

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ملک کے تقریباً تمام تاریخی مقامات دیکھنے میں آئے، مگر قلعۂ احمد نگر دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ جب بمبئی میں تھا، تو قصد بھی کیا تھا مگر پھر حالات نے مہلت نہ دی۔ یہ شہر بھی ہندستان کے اُن خاص مقامات میں سے ہے، جن کے ناموں کے ساتھ صدیوں کے انقلابوں کی داستانیں وابستہ ہو گئی ہیں۔ پہلے یہاں بھینگر نامی ندی کے کنارے ایک اسی نام کا گاؤں آباد تھا۔ پندرھویں صدی مسیحی کے اواخر میں جب دکن کی بہمنی حکومت کمزور پڑ گئی، تو ملک احمد نظام الملک بھیری نے علم استقلال بلند کیا اور بھینگر کے قریب احمد نگر کی بنیاد ڈال کر جنیر کی جگہ اُسے حاکم نشین شہر بنایا۔ اُس وقت سے نظام شاہی مملکت کا دار الحکومت یہی مقام بن گیا۔ فرشتہ، جس کا خاندان مازندران سے آ کر یہیں آباد ہوا تھا، لکھتا ہے، چند برسوں کے اندر اس شہر نے وہ رونق و وسعت پیدا کر لی تھی کہ بغداد اور قاہرہ کا مقابلہ کرنے لگا تھا:

کس پائمالِ آفتِ فرسودگی مباد
دیروز ریگِ بادیہ آئینہ خانہ بود!

ملک احمد نے جو قلعہ تعمیر کیا تھا، اس کا حصار مٹی کا تھا۔ اس کے لڑکے برہان نظام شاہ

اوّل نے اسے منہدم کر کے از سرِ نو پتھر کا حصار تعمیر کیا، اور اسے اس درجہ بلند اور مضبوط بنایا کہ مصر اور ایران تک اس کی مضبوطی کا غلغلہ پہنچا۔ ۱۸۰۳ء کی دوسری جنگِ مرہٹہ میں جب جنرل ویلزلی نے (جو آگے چل کر ڈیوک آف ویلنگٹن ہوا) اس کا معائنہ کیا تھا تو اگرچہ تین سو برس کے انقلابات سہ چکا تھا۔ پھر بھی اس کی مضبوطی میں فرق نہیں آیا تھا۔ اُس نے اپنے مراسلہ میں لکھا تھا کہ دکن کے تمام قلعوں میں صرف ویلور کا قلعہ ایسا ہے جسے مضبوطی کے لحاظ سے اس پر ترجیح دی جا سکتی ہے:

کارواں رفتہ و اندازۂ جاہش پیداست
زاں نشانہا کہ بہر راہگذار افتادست

یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر برہان نظام شاہ کی بہن چاند بی بی نے اپنے عزم و شجاعت کی یادگار زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں اور جنھیں تاریخ نے پتھر کی سلوں سے اتار کر اپنے اوراق و دفاتر میں محفوظ کر لیا ہے:

بیفشاں جرعہ بر خاک و حالِ اہلِ شوکت بیں
کہ از جمشید و کیخسرو ہزاراں داستاں دارد

اسی احمد نگر کے معرکوں میں عبدالرحیم خان خاناں کی جوانمردی کا وہ واقعہ نمایاں ہوا تھا جس کی سرگزشت عبدالباقی نہاوندی اور صمصام الدولہ نے ہمیں سنائی ہے جب احمد نگر کی مدد پر بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجیں بھی آگئیں اور خانخاناں کی قلیل التعداد فوج کو سہیل حبشی کی طاقتور فوج سے ٹکرانا پڑا، تو دولت خاں لودی نے پوچھا تھا "چنیں انبوہے در پیش [است] و فتح آسمانی۔ اگر [شکست] رُو دہد، جاے نشاں دہید کہ [ما] شمارا یاد کنیم"۔ خانخاناں نے جواب دیا تھا: "زیرا لا شہا:

ونحن أناسٌ لا توسّط بيننا
لنا الصدر دون العالمين أو القبر[۳۹]

احمد نگر کے نام نے حافظ کے کتنے ہی بھولے ہوئے نقوش یکایک تازہ کر دیے۔ ریل تیزی

کے ساتھ دوڑی جا رہی تھی۔ میدان کے بعد میدان گزرتے جاتے تھے۔ ایک منظر پر نظر جمنے نہیں پاتی تھی کہ دوسرا منظر سامنے آجاتا تھا، اور ایسا ہی ماجرا میرے دماغ کے اندر بھی گذر رہا تھا۔ احمد نگر اپنی چھ سو برس کی داستانِ کہن لیے ورق پر ورق الٹتا جاتا، ایک صفحہ پر ابھی نظر جمنے نہ پاتی کہ دوسرا سامنے آجاتا:

گاہے گاہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

مجھے خیال ہوا، اگر ہمارے قید و بند کے لیے یہی جگہ چنی گئی ہے، تو انتخاب کی موزونیت میں کلام نہیں۔ ہم خرابا تیوں کے لیے کوئی ایسا ہی خرابہ ہونا تھا:

بایک جہاں کدورت، باز ایں خرابہ جائیست

دو بجنے والے تھے کہ ٹرین احمد نگر پہنچی۔ اسٹیشن میں سناٹا تھا۔ صرف چند فوجی افسر ٹہل رہے تھے، انہی میں مقامی چھاؤنی کا کمانڈنگ آفیسر بھی تھا، جس سے ہمیں ملایا گیا ہم اترے اور فوراً اسٹیشن سے روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن سے قلعہ تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے۔ راہ میں کوئی موڑ نہیں ملی۔ میں سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ جب قدم اٹھا دیا، تو پھر کوئی موڑ نہیں ملتی۔ اگر مڑنا چاہیں تو صرف پیچھے ہی کی طرف مڑ سکتے ہیں، لیکن پیچھے مڑنے کی راہ یہاں پہلے سے بند ہو جاتی ہے:

ہاں رہِ عشق ست، کج گشتن ندارد بازگشت
جرم را ایں جا عقوبت ہست، استغفار نیست

اسٹیشن سے قلعہ تک کی مسافت زیادہ سے زیادہ دس بارہ منٹ کی ہوگی۔ قلعہ کا حصار پہلے کسی قدر فاصلے پر دکھائی دیا۔ پھر یہ فاصلہ چند لمحوں میں طے ہو گیا۔ اب اُس دنیا میں جو قلعہ سے باہر ہے اور اِس میں جو قلعہ کے اندر ہے، صرف ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا چشم زدن میں یہ بھی طے ہو گیا اور ہم قلعہ کی دنیا میں داخل ہو گئے۔ غور کیجیے تو زندگی کی تمام مسافتوں کا یہی حال ہے، خود زندگی اور موت کا باہمی فاصلہ بھی ایک قدم سے

زیادہ نہیں ہوتا۔

ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

قلعہ کی خندق، جس کی نسبت ابوالفضل نے لکھا ہے کہ چالیس گز چوڑی اور چودہ گز گہری تھی اور جسے ۱۸۰۳ء میں جنرل ویلزلی نے ایک سو آٹھ فٹ تک چوڑا پایا تھا، مجھے دکھائی نہیں دی۔ غالباً جس رُخ سے ہم داخل ہوئے، اس طرف پاٹ دی گئی ہے۔ اس کا بیرونی کنارہ جو کھدائی کی خاک ریز سے اس قدر اونچا کر دیا گیا تھا کہ قلعہ کی دیوار چھپ گئی تھی، وہ بھی اس رُخ پر نمایاں نہ تھا۔ ممکن ہے کہ وہ صورت اب باقی نہ رہی ہو۔

قلعہ کے اندر پہلے موٹر لاریوں کی قطار ملی، پھر ٹینکوں کی۔ اس کے بعد ایک احاطہ کے سامنے جو قلعہ کی عام سطح سے چودہ پندرہ فٹ بلند ہوگا اور اس لیے چڑھائی پر واقع ہے، کاریں رُک گئیں اور ہمیں اُترنے کے لیے کہا گیا۔ یہاں انسپکٹر جنرل پولیس، بمبئی نے جو ہمارے ساتھ آیا تھا، ہمارے ناموں کی فہرست کمانڈنگ آفیسر کے حوالہ کی۔ وہ فہرست لے کر دروازہ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ یہ گویا ہماری سپردگی کی باضابطہ رسم تھی۔ اب ہماری حفاظت کا سررشتہ حکومتِ بمبئی کے ہاتھ سے نکل کر فوجی انتظام کے ہاتھ آگیا اور ہم ایک دنیا سے نکل کر دوسری دنیا میں داخل ہو گئے:

در جستجوے ما نہ کشی زحمتِ سراغ
جائے رسیدہ ایم کہ عنقا نمی رسد

دروازے کے اندر داخل ہوئے تو ایک مستطیل احاطہ سامنے تھا، غالباً دو سو فٹ لمبا اور ڈیڑھ سو فٹ چوڑا ہوگا۔ اس کے تینوں طرف بارک کی طرح کمروں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ کمروں کے سامنے برآمدہ ہے اور بیچ میں کھلی جگہ ہے، یہ اگرچہ اتنی وسیع نہیں کہ اسے میدان کہا جا سکے، تاہم احاطہ کے زندانیوں کے لیے میدان کا کام دے سکتی ہے۔ آدمی کمرہ سے باہر نکلے گا تو محسوس کرے گا کہ کھلی جگہ میں آگیا۔ کم از کم اتنی جگہ

ضرور ہے کہ جی بھر کے خاک اڑائی جا سکتی ہے:

سر پر ہجوم درد غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

صحن کے وسط میں ایک پختہ چبوترہ ہے جس میں جھنڈے کا مستول نصب ہے، مگر جھنڈا اتار لیا گیا ہے۔ میں نے مستول کی بلندی دیکھنے کے لیے سر اٹھایا تو وہ اشارہ کر رہا تھا:

یہیں ملیں گے تجھے نالۂ بلند ترے

احاطہ کے شمالی کنارہ میں ایک پرانی ٹوٹی ہوئی قبر ہے۔ نیم کے ایک درخت کی شاخیں اس پر سایہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، مگر کامیاب نہیں ہوتیں۔ قبر کے سرہانے ایک چھوٹا سا طاق ہے۔ طاق اب چراغ سے خالی ہے، مگر محراب کی رنگت بول رہی ہے کہ یہاں کبھی ایک دیا جلا کرتا تھا:

اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں

معلوم نہیں یہ کس کی قبر ہے! چاند بی بی کی ہو نہیں سکتی کیونکہ اس کا مقبرہ قلعہ سے باہر ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ بہر حال کسی کی ہو، مگر کوئی مجہول الحال شخصیت نہ ہوگی، ورنہ جہاں قلعہ کی تمام عمارتیں گرائی تھیں، وہیں اسے بھی گرا دیا ہوتا۔ سبحان اللہ! اس روزگار خراب کی ویرانیاں بھی اپنی آبادیوں کے کرشمے رکھتی ہیں! اس پرانی قبر کو ویران بھی ہونا تھا تو اس لیے کہ کبھی ہم زندانیان خرابات کے شور و ہنگامہ سے آباد ہو!

کشتوں کا تیری چشمِ سیہ مست کے مزار
ہوگا خراب بھی، تو خرابات ہووے گا!

مغربی رُخ کے تمام کمرے کھلے اور چشم براہ تھے۔ قطار کا پہلا کمرہ میرے حصے میں آیا۔ میں نے اندر قدم رکھتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ چارپائی پر جو کہ بچھی ہوئی تھی، دراز ہو گیا۔ نو مہینے کی نیند اور تھکن میرے ساتھ بستر پر گری:

ماگوشہ را نہ بہر قناعت گرفتہ ایم
تن پروری بہ گوشۂ خاطر رسیدہ است

تقریباً تین بجے سے چھ بجے تک سوتا رہا۔ پھر رات کو ۹ بجے تکیہ پر سر رکھا تو صبح تین بجے آنکھ کھلی!

نے تیر کماں میں ہے، نہ صیّاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

تین بجے اٹھا، تو تازہ دم اور چست و چاق تھا۔ نہ سر میں گرانی تھی، نہ انفلوئنزا کا نام و نشان تھا۔ فوراً بجلی کا آلۂ حرارت کام میں لایا۔ اور چائے دم دی۔ اب جام و صراحی سامنے دھرے بیٹھا ہوں۔ آپ کو مخاطب تصوّر کرتا ہوں اور یہ داستانِ بے ستون و کوہکن سُنا رہا ہوں:

شیریں تر از حکایتِ ما نیست قصّۂ
تاریخِ روزگار سراپا نوشتہ ایم

مہینوں سے ایسی گہری اور آسودہ نیند نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل صبح بمبئی سے چلتے ہوئے جو دامن جھاڑنا پڑا تھا، تو علائق کی گرد کے ساتھ مہینوں کی ساری تھکن بھی نکل گئی تھی۔ یغمائے جندقی کیا خوب کہہ گیا ہے:

غلط گفتی: چرا سجّادۂ تقویٰ گرو کردی!
بزہد آلودہ بودم، گر نمی کردم، چہ می کردم؟

یہ اسی غزل کا شعر ہے جس کا ایک اور شعر جو مجتہد کاشان کی نسبت کہا تھا، بہت مشہور ہو چکا ہے:

ز شیخ شہر جاں بردم بہ تزویرِ مسلمانی
مدارا گر بایں کافر نمی کردم، چہ می کردم؟

ردیف کا نبھانا آسان نہ تھا مگر دیکھیے، کس طرح بول رہی ہے، بول نہیں رہی ہے، چیخ

رہی ہے۔ میں بھی اس وقت چائے کے فنجان پر فنجان لنڈھائے جاتا ہوں، اور اس کا مطلع دہرا رہا ہوں:

زساغر گرد ماغے ترنمی کردم، چہ می کردم!

خدارا، داد دیجیے۔ نظر بہ حالتِ موجودہ یہاں "چہ می کردم" کیا قیامت ڈھا رہا ہے! گویا یہ مصرعہ خاص اسی موقع کے لیے کہا گیا تھا۔ مگر یوں پتہ نہیں چلے گا، "چہ می کردم" پر زیادہ سے زیادہ زور دے کر پڑھیے۔ پھر دیکھیے، صورتِ حال کی پوری تصویر کس طرح سامنے نمودار ہو جاتی ہے۔

یہ جو کچھ لکھ رہا ہوں، کلپترہ گوئی اور لاطائل نویسی سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم، بحالتِ موجودہ میری صدائیں آپ تک پہنچ بھی سکیں گی یا نہیں! تاہم کیا کروں، افسانہ سرائی سے اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکتا۔ یہ وہی حالت ہوئی، جسے مرزا غالب نے ذوقِ خامہ فرسا کی ستم زدگی سے تعبیر کیا تھا:

مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

ابوالکلام

قلعۂ احمد نگر

۱۱ر اگست ۱۹۴۲ء

صدیقِ مکرّم!

قید و بند کی زندگی کا یہ چھٹا تجربہ ہے۔ پہلا تجربہ ۱۹۱۶ء میں پیش آیا تھا، جب مُسلسل چار برس تک قید و بند میں رہا۔ پھر ۱۹۲۱ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۰ء میں یکے بعد دیگرے یہی منزل پیش آتی رہی، اور اب پھر اُسی منزل سے قافلۂ باد پیمائے عُمر گزر رہا ہے:

باز می خواہم ز سر گیرم رہِ پیمودہ را

پچھلی پانچ گرفتاریوں کی اگر مجموعی مُدّت شُمار کی جائے، تو سات برس آٹھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوگی۔ عُمر کے ترپن برس جو گزر چکے ہیں، اُن سے یہ مُدّت وضع کرتا ہوں، تو ساتویں حصّے کے قریب پڑتی ہے۔ گویا زندگی کے ہر سات دِن میں سے ایک دِن قید خانے کے اندر گُزارا۔ تورات کے احکامِ عشرہ میں ایک حُکم، سبت کے لیے بھی تھا۔ یعنی ہفتہ کا ساتواں دِن تعطیل کا مُقدّس دِن سمجھا جائے۔ مسیحیت اور اِسلام نے بھی یہ تعطیل قائم رکھی، سو ہمارے حصّہ میں بھی سبت کا دِن آیا۔ مگر ہماری تعطیلیں اِس طرح بسر ہوئیں، گویا خواجۂ شیراز کے دستور العمل پر کاربند رہے۔

نہ گویمت کہ ہمہ سال مے پرستی کن
سہ ماہ مے خور و نہ ماہ پارسا می باش

ہ یہ مکتوب ۱۱ر اگست ۱۹۴۲ء کو لکھا تھا، اِس کے بعد قید کے ۲ برس گیارہ مہینے اور گزر گئے اور مجموعی مدّت سات برس آٹھ مہینے کی جگہ دس برس سات ماہ ہوگئی۔ اِس اِضافہ کے خلاف کوئی شکوہ کرنا نہیں چاہتا، البتّہ اِس کا افسوس ضرور ہے کہ وہ ساتویں حصّہ کی مناسبت کی بات مختل ہوگئی، اور سبت کی تعطیل کا معاملہ ہاتھ سے نکل گیا۔

وقت کے حالات پیشِ نظر رکھتے ہوئے اِس تناسُب پر غور کرتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے۔ اِس پر نہیں کہ سات برس آٹھ مہینے قید و بند میں کیوں کٹے؟ اِس پر کہ صرف سات برس آٹھ مہینے ہی کیوں کٹے؟

نالہ از بہرِ رہائی نہ کند مُرغِ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بُود

وقت کے جو حالات ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، اُن میں اِس مُلک کے باشندوں کے لیے زندگی بسر کرنے کی دو ہی راہیں رہ گئی ہیں: بے حسی کی زندگی بسر کریں یا احساسِ حال کی۔ پہلی زندگی ہر حال میں اور ہر جگہ بسر کی جا سکتی ہے، مگر دُوسری کے لیے قید خانہ کی کوٹھری کے سوا اور کہیں جگہ نہ نکل سکی۔ ہمارے سامنے بھی دونوں راہیں کھُلی تھیں۔ پہلی ہم اختیار نہیں کر سکتے تھے، ناچار دوسری اختیار کرنی پڑی:

رندِ ہزار شیوہ را اِطاعتِ حق گراں نہ بود
لیک صنم بہ سجدہ در ناصیہ مُشترک نخواست

زندگی میں جتنے جُرم کیے اور سزائیں پائیں، سوچتا ہوں تو ان سے کہیں زیادہ تعداد اُن جُرموں کی تھی جو نہ کر سکے، اور جن کے کرنے کی حسرت دِل میں رہ گئی۔ یہاں کردہ جُرموں کی سزائیں تو مل جاتی ہیں، لیکن ناکردہ جُرموں کی حسرتوں کا صِلہ کس سے مانگیں؟

ناکردہ گُناہوں کی بھی حسرت کی مِلے داد
یارب! اگر اِن کردہ گُناہوں کی سزا ہے

۱۹۱۶ء میں جب یہ معاملہ پیش آیا، تو مجھے پہلی مرتبہ موقع مِلا کہ اپنی طبیعت کے تاثّرات کا جائزہ لوں۔ اُس وقت عُمر کے صرف ساٹھ برس گزرے تھے۔ "الہلال" "البلاغ" کے نام سے جاری تھا۔ "دار الارشاد" قائم ہو چکا تھا۔ زندگی کی گہری مشغولیتیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ طرح طرح کی سرگرمیوں میں دِل اٹکا ہُوا اور علاقوں اور رابطوں کی گرانیوں سے بوجھل تھا۔ اچانک ایک دِن دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہونا پڑا۔ اور مشغولیت کی ڈوبی ہوئی زندگی کی

جگہ قید و بند کی تنہائی اور بے تعلقی اختیار کر لینی پڑی۔ بہ ظاہر اِس ناگہانی اِنقلابِ حال میں طبیعت کے لیے بڑی آزمائش ہونی تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہیں ہوئی۔ آباد گھر چھوڑا اور ایک ویرانے میں جا بیٹھ رہا۔

نقصاں نہیں جنوں میں، بلا سے ہو گھر خراب
دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

لیکن پھر کچھ عرصہ کے بعد جب اِس صورتحال کا ردِّ فعل شروع ہوا، تو معلوم ہوا کہ معاملہ اِتنا سہل نہ تھا، جتنا اِبتدائے حال کی سرگرمیوں میں محسوس ہوا تھا، اور اس کی آزمائشیں ابھی گزر نہیں چکیں، بلکہ اب پیش آ رہی ہیں۔

جب کبھی اِس طرح کا معاملہ یکایک پیش آجاتا ہے، تو اِبتدا میں اُس کی سختیاں پوری طرح محسوس نہیں ہوتیں، کیوں کہ طبیعت میں مُقاومت کا ایک سخت جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، اور وہ نہیں چاہتا کہ صورتِ حال سے دب جائے۔ وہ اُس کا غالبانہ مُقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک پُرجوش نشّہ کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ نشّہ کی تیزی میں کتنی ہی سخت چوٹ لگے، اُس کی تکلیف محسوس نہیں ہوگی۔ تکلیف اُس وقت محسوس ہوگی، جب نشّہ اترنے لگے گا اور جماہیاں آنا شروع ہوں گی۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوگا جیسے سارا جسم درد سے چور چور ہو رہا ہو۔ چنانچہ اِس مُعاملہ میں بھی پہلا دَور نشّۂ جذبات کی خود فراموشیوں کا گزرا، علائق کا فوری اِنقطاع، کاروبار کی ناگہانی برہمی، مشغولیتوں کا یک قلم تعطّل، کوئی بات بھی دامنِ دل کو کھینچ نہ سکی۔ کلکتہ سے بہ اطمینان تمام نکلا اور رانچی میں شہر کے باہر ایک غیر آباد حصّہ میں مقیم ہو گیا۔ لیکن پھر جوں جوں دِن گزرتے گئے، طبیعت کی بے پروائیاں جواب دینے لگیں۔ اور صورتِ حال کا ایک ایک

لہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۶ء کو حکومتِ بنگال نے ڈیفنس آرڈی ننس کے ماتحت مجھے بنگال سے خارج کر دیا تھا۔ میں رانچی گیا اور شہر سے باہر مورابادی میں مقیم ہو گیا۔ پھر کچھ دِنوں کے بعد مرکزی حکومت نے وہیں قید کر دیا اور اِس کا سلسلہ ۱۹۲۰ء تک جاری رہا۔

کانٹا پہلوئے دِل میں چُبھنے لگا۔ یہی وقت تھا، جب مجھے اپنی طبیعت کی اِس اِنفعالی حالت کا مُقابلہ کرنا پڑا، اور ایک خاص طرح کا سانچا اُس کے لیے ڈھالنا پڑا۔ اُس وقت سے لے کر آج تک چھبیس برس گزر چکے ہیں، وہی سانچا کام دے رہا ہے، اور اب اِس قدر پختہ ہو چکا ہے کہ ٹوٹ جا سکتا ہے، مگر لچک نہیں کھا سکتا۔

طالب علمی کے زمانے سے فلسفہ میری زندگی کا خاص موضوع رہا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ دلچسپی بھی برابر بڑھتی گئی۔ لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ عملی زندگی کی تلخیاں گوارا کرنے میں فلسفہ سے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ یہ بلاشبہ طبیعت میں ایک طرح کی رواقی (STOIC AL) بے پروائی پیدا کر دیتا ہے اور ہم زندگی کے حوادث و آلام کو عام سطح سے کچھ بلند ہو کر دیکھنے لگتے ہیں، لیکن اِس سے زندگی کے طبعی اِنفعالات کی گتھیاں سُلجھ نہیں سکتیں۔ یہ ہمیں ایک طرح کی تسکین ضرور دے دیتا ہے، لیکن اِس کی تسکین سرتاسر سلبی تسکین ہوتی ہے، ایجابی تسکین سے اِس کی جھولی ہمیشہ خالی رہی۔ یہ "فقدان" کا افسوس کم کر دے گا، لیکن حاصل کی کوئی اُمید نہیں دِلائے گا۔ اگر ہماری راحتیں ہم سے چھین لی گئی ہیں تو فلسفہ ہمیں کلیلہ و دِمنہ (پنچ تنتر) کی دانش آموز چڑیا کی طرح نصیحت کرے گا: لا تاس علیٰ ما فات (جو کچھ کھو چکا، اُس پر افسوس نہ کر۔)۔ لیکن کیا اِس کھونے کے ساتھ کچھ پانا بھی ہے؟ اِس بارے میں وہ ہمیں کچھ نہیں بتلاتا۔ کیوں کہ بتلا سکتا ہی نہیں۔ اور اِس لیے زندگی کی تلخیاں گوارا کرنے کے لیے صرف اِس کا سہارا کافی نہ ہوا۔

سائنس عالمِ محسوسات کی ثابت شدہ حقیقتوں سے ہمیں آشنا کرتا ہے، اور مادّی زندگی کی بے رحم جبریت (PHYSICAL DETERMINISM) کی خبر دیتا ہے، اِس لیے عقیدہ کی تسکین اس کے بازار میں بھی نہیں مل سکتی۔ وہ یقین اور اُمید کے سارے پچھلے چراغ گُل کر دے گا مگر کوئی نیا چراغ رَوشن نہیں کرے گا۔

پھر اگر ہم زندگی کی ناگواریوں میں سہارے کے لیے نظر اُٹھائیں، تو کس طرف اُٹھائیں؟

کون ایسا ہے جسے دست ہو دل سازی میں؟
شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیوند!

ہمیں مذہب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی دیوار ہے جس سے ایک دکھتی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے:

دلِ شکستہ دراں کوچہ می گنند درست
چنانکہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست

بلاشبہ مذہب کی وہ پرانی دنیا جس کی مافوق الفطرت کارفرمائیوں کا یقین ہمارے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا، اب ہمارے لیے باقی نہیں رہی۔ اب مذہب بھی ہمارے سامنے آتا ہے تو عقلیت اور منطق کی ایک سادہ اور بے رنگ چادر اوڑھ کر آتا ہے، اور ہمارے دلوں سے زیادہ ہمارے دماغ کو مخاطب کرنا چاہتا ہے۔ تاہم اب بھی تسکین اور یقین کا سہارا مل سکتا ہے تو اسی سے مل سکتا ہے:

درِ دیگرے بنما کہ من بکجا روم، چو برانیم

فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا، اور پھر اسے بند نہیں کر سکے گا۔ سائنس ثبوت دے دے مگر عقیدہ نہیں دے سکے گا۔ لیکن مذہب ہمیں عقیدہ دے دیتا ہے۔ اگرچہ ثبوت نہیں دیتا۔ اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے صرف ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ عقیدہ کی بھی ضرورت ہے۔ ہم صرف انھیں باتوں پر قناعت نہیں کر لے سکتے، جنھیں ثابت کر سکتے ہیں، اور اس لیے مان لیتے ہیں۔ ہمیں کچھ باتیں ایسی بھی چاہئیں جنھیں ثابت نہیں کر سکتے، لیکن مان لینا پڑتا ہے:

BY FAITH, AND FAITH ALONE, EMBRACE
BLIEVING, WHERE WE CANNOT PROVE.

عام حالات میں مذہب انسان کو اس کے خاندانی ورثہ کے ساتھ ملتا ہے، اور مجھے بھی ملا، لیکن میں موروثی عقائد پر قانع نہ رہ سکا۔ میری پیاس اس سے زیادہ نکلی، جتنی سیرابی وہ دے سکتے تھے۔

مجھے پرانی راہوں سے نکل کر خود اپنی نئی راہیں ڈھونڈنی پڑیں۔ زندگی کے ابھی پندرہ برس بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ طبیعت نئی خلشوں اور نئی جستجوؤں سے آشنا ہو گئی تھی، اور موروثی عقائد جس شکل و صورت میں سامنے آکھڑے ہوئے تھے، اُن پر مطمئن ہونے سے انکار کرنے لگی تھی۔ پہلے اسلام کے اندرونی مذاہب کے اختلافات سامنے آئے، اور اُن کے متعارض دعووں اور متصادم فیصلوں نے حیران و سرگشتہ کر دیا۔ پھر جب کچھ قدم آگے بڑھے، تو خود نفسِ مذہب کی عالم گیر نزاعیں سامنے آگئیں، اور انھوں نے حیرانگی کو شک تک، اور شک کو انکار تک پہنچا دیا۔ پھر اس کے بعد مذہب اور علم کی باہمی آویزشوں کا میدان نمودار ہوا، اور اس نے رہا سہا اعتقاد بھی کھو دیا۔ زندگی کے وہ بنیادی سوال جو عام حالات میں بہت کم ہمیں یاد آتے ہیں، ایک ایک کر کے اُبھرے اور دل و دماغ پر چھا گئے۔ حقیقت کیا ہے، اور کہاں ہے؟ اور ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے، اور ایک ہی ہے، کیوں کہ ایک سے زیادہ حقیقتیں ہو نہیں سکتیں، تو پھر راستے مختلف کیوں ہوئے؟ کیوں صرف مختلف ہی نہیں ہوئے، بلکہ باہم متعارض اور متصادم ہوئے؟ پھر یہ کیا ہے کہ خلاف و نزاع کی ان تمام لڑتی ہوئی راہوں کے سامنے "علم" اپنے بے لچک فیصلوں اور ٹھوس حقیقتوں کا چراغ ہاتھ میں لیے کھڑا ہے، اور اس کی بے رحم روشنی میں قدامت اور روایت کی وہ تمام پُراسرار تاریکیاں جنھیں نوعِ انسانی عظمت و تقدیس کی نگاہ سے دیکھنے کی خوگر ہو گئی تھی، ایک ایک کر کے نابود ہو رہی ہیں۔

یہ راہ ہمیشہ شک سے شروع ہوتی ہے، اور انکار پر ختم ہوتی ہے۔ اگر قدم اُسی پر رُک جائیں تو پھر مایوسی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا:

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟

مجھے بھی ان منزلوں سے گزرنا پڑا، مگر میں رُکا نہیں، میری پیاس مایوسی پر قانع ہونا نہیں چاہتی تھی۔ بالآخر حیرانگیوں اور سرگشتگیوں کے بہت سے مرحلے طے کرنے کے بعد جو مقام نمودار ہوا، اُس نے ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیا۔ معلوم ہوا کہ اختلاف و نزاع کی انہی

متعارض راہوں اور اوہام وخیالات کی انہی گہری تاریکیوں کے اندر ایک روشن اور قطعی راہ بھی موجود ہے، جو یقین اور اعتقاد کی منزلِ مقصود تک چلی گئی ہے۔ اور اگر سکون وطمانیت کے سرچشمے کا سُراغ مل سکتا ہے، تو وہیں مل سکتا ہے۔ میں نے جو اعتقاد حقیقت کی جستجو میں کھو دیا تھا وہ اسی جستجو کے ہاتھوں پھر واپس مل گیا۔ میری بیماری کی جو علت تھی، وہی بالآخر دوائے شفا بھی ثابت ہوئی۔

تداویت من لیلیٰ بلیلیٰ عن الھویٰ
کما یتداوی شارب الخمر بالخمر

البتہ جو عقیدہ کھویا تھا، وہ تقلیدی تھا، اور جو عقیدہ اب پایا وہ تحقیقی تھا۔

راہے کہ خضر داشت، ز سرچشمہ دور بود
لب تشنگی ز راہِ دگر بردہ ایم ما

جب تک موروثی عقائد کے جمود اور تقلیدی ایمان کی چشم بندیوں کی پٹیاں ہماری آنکھوں پر بندھی رہتی ہیں، ہم اُس کا سُراغ نہیں پا سکتے، لیکن جوں ہی یہ پٹیاں کھلنے لگتی ہیں، صاف دکھائی دینے لگتا ہے کہ راہ نہ تو دور تھی، اور نہ کھوئی ہوئی تھی۔ یہ خود ہماری ہی چشم بندی تھی جس نے عین روشنی میں گم کر دیا تھا:

در دشتِ آرزو نہ بود بیم دام و دد
راہے ست ایں کہ ہم ز تو خیزد بلائے تو

اب معلوم ہوا کہ جسے مذہب سمجھتے آئے تھے وہ مذہب کہاں تھا؟ وہ تو خود ہماری ہی وہم پرستیوں اور غلط اندیشیوں کی ایک صورت گری تھی:

تا بغایت ما ہنر پنداشتیم
عاشقی ہم ننگ دعائے بودہ است

ایک مذہب تو موروثی مذہب ہے کہ باپ دادا جو کچھ مانتے آئے ہیں، مانتے رہیے۔ ایک جغرافیائی مذہب ہے کہ زمین کے کسی خاص ٹکڑے میں ایک شاہ راہ عام بن گئی ہے، سب

اُسی پر چلتے ہیں، آپ بھی چلتے رہیے۔ ایک مردم شماری کا مذہب ہے، کہ مردم شماری کے کاغذات میں ایک خانہ مذہب کا بھی ہوتا ہے، اِس میں اِسلام درج کرا دیجیے۔ ایک رسمی مذہب ہے کہ رسموں اور تقریبوں کا ایک سانچا ڈھل گیا ہے، اُسے نہ چھیڑیے اور اُسی میں ڈھلتے رہیے، لیکن اِن تمام مذہبوں کے علاوہ بھی مذہب کی ایک حقیقت باقی رہ جاتی ہے تعریف و امتیاز کے لیے اُسے حقیقی مذہب کے نام سے پکارنا پڑتا ہے، اور اُسی کی راہ گم ہو جاتی ہے:

ہمیں ورق کہ سیہ گشت مدّعا ایں جاست

اِسی مقام پر یہ حقیقت بھی بے نقاب ہوئی کہ علم اور مذہب کی جتنی نزاع ہے، فی الحقیقت علم اور مذہب کی نہیں ہے۔ مدّعیانِ علم کی خام کاریوں اور مدّعیانِ مذہب کی ظاہر پرستیوں اور قواعد سازیوں کی ہے۔ حقیقی علم اور حقیقی مذہب اگرچہ چلتے ہیں الگ الگ راستوں سے، مگر بالآخر پہنچ جاتے ہیں ایک ہی منزل پر:

عباراتنا شتی وحسنک واحد
وکل إلی ذاک الجمال یشیر

علم عالمِ محسوسات سے سروکار رکھتا ہے۔ مذہب ماورائے محسوسات کی خبر دیتا ہے۔ دونوں میں دائروں کا تعدّد ہوا، مگر تعارض نہیں ہوا۔ جو کچھ محسوسات سے ماورا ہے، ہم اُسے محسوسات سے معارض سمجھ لیتے ہیں، اور یہیں سے ہمارے دیدۂ کج اندیش کی ساری درماندگیاں شروع ہو جاتی ہیں:

بر چہرۂ حقیقت اگر ماند پردہ
جرم نگاہِ دیدۂ صورت پرست ماست

بہر حال زندگی کی دشواریوں میں مذہب کی تسکین صرف ایک سلبی تسکین ہی نہیں ہوتی بلکہ ایجابی تسکین ہوتی ہے، کیوں کہ وہ ہمیں اعمال کے اخلاقی اقدار (MORAL VALUES) کا یقین دلاتا ہے، اور یہی یقین ہے جس کی روشنی کسی دوسری جگہ سے نہیں مل سکتی۔ وہ ہمیں

بتلاتا ہے کہ زندگی ایک فریضہ ہے جسے انجام دینا چاہیے۔ ایک بوجھ ہے جسے اُٹھانا چاہیے:

جلوۂ کاروانِ ما نیست ، نالۂ جرس

عشقِ تو راہ می برد ، شوقِ تو زاد می دہد

لیکن کیا یہ بوجھ کانٹوں پر چلے بغیر نہیں اُٹھایا جا سکتا؟

نہیں اُٹھایا جا سکتا، کیوں کہ یہاں خود زندگی کے تقاضے ہوئے جن کا ہمیں جواب دینا ہے، اور خود زندگی کے مقاصد ہوئے جن کے پیچھے والہانہ دوڑنا ہے۔ جن باتوں کو ہم زندگی کی راحتوں اور لذتوں سے تعبیر کرتے ہیں، وہ ہمارے لیے راحتیں اور لذتیں ہی کب رہیں گی؟ اگر ان تقاضوں اور مقصدوں سے منھ موڑ لیں۔ بلاشبہ یہاں زندگی کا بوجھ اُٹھا کے کانٹوں کے فرش پر دوڑنا پڑا لیکن اس لیے دوڑنا پڑا کہ دیبا و مخمل کے فرش پر چل کر ان تقاضوں کا جواب نہیں دیا جا سکتا تھا۔ کانٹے کبھی دامن سے اُلجھیں گے، کبھی تلووں میں چبھیں گے، لیکن مقصد کی خلش جو پہلوئے دل میں چبھتی رہے گی، نہ دامنِ تار تار کی خبر لینے دے گی، نہ زخمی تلووں کی:

معشوق در میانۂ جاں ، مدعی کجا ست؟

گل در دماغ می دمد، آسیبِ خار چیست؟

اور پھر زندگی کی جن حالتوں کو ہم راحت و الم سے تعبیر کرتے ہیں، اُن کی حقیقت بھی اس سے زیادہ کیا ہوئی کہ اضافت کے کرشموں کی ایک صورت گری ہے۔ یہاں نہ مطلق راحت ہے نہ مطلق الم، تمام احساسات سرتاسر اضافی ہیں:

دویدن، رفتن، ایستادن، نشستن، خفتن و مُردن

اضافتیں بدلتے جاؤ، راحت و الم کی نوعیتیں بھی بدلتی جائیں گی۔ یہاں ایک ہی ترازو لے کر ہر طبیعت اور ہر حالت کا احساس نہیں تولا جا سکتا۔ ایک دہقان کی راحت و الم تولنے کے لیے جس ترازو سے ہم کام لیتے ہیں، اُس سے فنونِ لطیفہ کے ایک ماہر کا معیارِ راحت و الم نہیں تول سکیں گے۔ ایک ریاضی داں کو ریاضی کا ایک مسئلہ حل کرنے میں جو لذت ملتی ہے وہ ایک ہوس پرست کو شبستانِ عشرت کی سیہ مستیوں میں کب مل سکے گی؟ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم پھولوں

کی سیج پر لوٹتے ہیں اور راحت نہیں پاتے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کانٹوں پر دوڑتے ہیں، اور اُس کی ہر چبھن میں راحت و سرور کی ایک نئی لذّت پانے لگتے ہیں:

بہرِ یک گل، زحمتِ صد خار می باید کشید

راحت و الم کا احساس ہمیں باہر سے لاکر کوئی نہیں دے دیا کرتا۔ یہ خود ہمارا ہی احساس ہے جو کبھی زخم لگاتا ہے، کبھی مرہم بن جاتا ہے۔ طلب و سعی کی زندگی بجائے خود زندگی کی سب سے بڑی لذّت ہے، بشرطے کہ کسی مطلوب کی راہ میں ہو:

رہرواں را خستگیِ راہ نیست
عشق ہم راہ ست و ہم خود منزل ست

اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں، فلسفہ نہیں ہے، زندگی کے عام واردات ہیں۔ عشق و محبت کے واردات کا میں حوالہ نہیں دوں گا، کیوں کہ وہ ہر شخص کے حصّے میں نہیں آسکتے۔ لیکن رندی و ہوس ناکی کے کوچوں کی خبر رکھنے والے تو بہت نکلیں گے۔ وہ خود اپنے دل سے پوچھ دیکھیں کہ کسی کی راہ میں رنج و الم کی تلخیوں نے کبھی خوش گواریوں کے مزے بھی دیے تھے یا نہیں؟

حریفِ کاوشِ مژگانِ خوں ریزش نہ ناصح!
بدست آور رگِ جانے، و نشتر را تماشا کُن

زندگی بغیر کسی مقصد کے بسر نہیں کی جاسکتی۔ کوئی اٹکاؤ، کوئی لگاؤ، کوئی بندھن ہونا چاہیے۔ جس کی خاطر زندگی کے دن کاٹے جاسکیں۔ یہ مقصد مختلف طبیعتوں کے سامنے مختلف شکلوں میں آتا ہے:

زاہد بہ نماز و روزہ ضبطے دارد سرمد بہ مے و پیالہ ربطے دارد

کوئی زندگی کی کاربرآریوں ہی کو مقصدِ زندگی سمجھ کر اُن پر قانع ہوجاتا ہے، کوئی اُن پر قانع نہیں ہوسکتا۔ جو قانع نہیں ہوسکتے، اُن کی حالتیں بھی مختلف ہوئیں۔ اکثروں کی پیاس ایسے مقصدوں سے سیراب ہوجاتی ہے جو انھیں مشغول رکھ سکیں۔ لیکن کچھ طبیعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے لیے صرف مشغولیت کافی نہیں ہوسکتی۔ وہ زندگی کا اضطراب بھی چاہتی ہیں:

نہ داغِ تازہ می کارد، نہ زخمِ کہنہ می خارد

بدہ یارب! دِلے، کیں صورتِ بیجاں نمی خواہم

پہلوں کے لیے جو دِل بستگی اِس میں ہوئی کہ مشغول رہیں، دوسروں کے لیے اِس میں ہوئی کہ مُضطرب رہیں:

دریں چمن کہ ہوا داغِ شبنم آرائی ست

تسلّیے بہ ہزار اِضطراب می بافند

ایک خُنک اور نا آشنائے شورش مقصد سے اُن کی پیاس نہیں بُجھ سکتی۔ انھیں ایسا مقصد چاہیے جو اِضطراب کے انگاروں سے دہک رہا ہو، جو اُن کے اندر شورش و سرمستی کا ایک تہلکہ مچادے۔ جس کے دامنِ ناز کو پکڑنے کے لیے وہ ہمیشہ اپنا گریبانِ وحشت چاک کرتے رہیں:

دامن اُس کا تو بھلا دُور ہے اے دستِ جنوں!

کیوں ہے بیکار؟ گریباں تو مِرا دُور نہیں

ایک ایسا بلائے جاں مقصد، جس کے پیچھے اُنھیں دیوانہ وار دَوڑنا پڑے، جو دَوڑنے والوں کو ہمیشہ نزدیک بھی دِکھائی دے، اور ہمیشہ دُور بھی ہوتا رہے۔ نزدیک اِتنا کہ جب چاہیں ہاتھ بڑھا کر پکڑلیں، دور اِتنا کہ اُس کی گردِ راہ کا بھی سُراغ نہ پاسکیں:

با من آویزشِ او اُلفتِ موج ست و کنار

دم بہ دم با من و ہر لحظہ گُریزاں از من

پھر نفسیاتی نُقطۂ نگاہ سے دیکھیے، تو معاملہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے صرف تہ رس نگاہیں ہی دیکھ سکتی ہیں۔ یکسانی اگرچہ سکون و راحت کی ہو، یکسانی ہوئی، اور یکسانی بہ جائے خود زندگی کی سب سے بڑی بے نمکی ہے۔ تبدیلی اگرچہ سکون سے اِضطراب کی ہو، مگر پھر تبدیلی ہے، اور تبدیلی بہ جائے خود زندگی کی ایک بڑی لذّت ہوئی۔ عربی میں کہتے ہیں حضّوا مجالکم اپنی مجلسوں کا ذائقہ بدلتے رہو، سو یہاں زندگی کا مزہ بھی انہی کو مل سکتا ہے جو اِس کی شیرینیوں کے ساتھ اِس کی تلخیوں کے بھی گھونٹ لیتے رہتے ہیں، اور اِس طرح زندگی کا ذائقہ بدلتے رہتے

ہیں۔ ورنہ وہ زندگی ہی کیا جو ایک ہی طرح کی صبحوں اور ایک ہی طرح کی شاموں میں بسر ہوتی رہے۔
خواجہ درد کیا خوب کہہ گئے ہیں:

آجائے ایسے جینے سے اپنا تو جی بہ تنگ
آخر جیے گا کب تلک اے خضر! مر کہیں

یہاں پانے کا مزہ انھیں کو مل سکتا ہے جو کھونا جانتے ہیں۔ جنھوں نے کچھ کھویا ہی نہیں، انھیں کیا معلوم کہ پانے کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ نظیری کی نظر اسی حقیقت کی طرف گئی تھی۔

آنکہ او در کلبۂ احزاں پسر گم کردہ یافت
تو کہ چیزے گم نہ کردی، از کجا پیدا شود

اور پھر غور و فکر کا ایک اور قدم آگے بڑھائیے، تو خود ہماری زندگی کی حقیقت بھی حرکت و اضطراب کے ایک تسلسل کے سوا اور کیا ہے؟ جس حالت کو ہم سکون سے تعبیر کرتے ہیں اگر چاہیں تو اسی کو موت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ موج جب تک مضطرب ہے، زندہ ہے، آسودہ ہوئی اور معدوم ہوئی۔ فارسی کے ایک شاعر نے دو مصرعوں کے اندر سارا فلسفۂ حیات ختم کر دیا تھا:

موجیم کہ آسودگیِ ما عدمِ ماست
ما زندہ ازانیم کہ آرام نگیریم

اور پھر یہ راہ اس طرح بھی طے نہیں کی جا سکتی کہ اس کے اٹکاؤ کے ساتھ دوسرے لگاؤ بھی لگائے رکھیے۔ راہِ مقصد کی خاک بڑی ہی غیور واقع ہوئی ہے۔ وہ رہرو کی جبینِ نیاز کے سارے سجدے اس طرح کھینچ لیتی ہے کہ پھر کسی دوسری چوکھٹ کے لیے کچھ باقی ہی نہیں رہتا۔ دیکھیے، میں نے یہ تشبیہ غالب سے مستعار لی:

خاکِ کویش خود پسند افتاد در جذبِ سجود
سجدہ از بہرِ حرم نہ گزاشت در سیمائے من

مقصود اس تمام دراز نفسی سے یہ تھا کہ آج اپنے اوراقِ فکرِ پریشاں کا ایک صفحہ آپ کے سامنے

کھول دوں :

لختے زحالِ خویش بہ سیما نوشتہ ایم

اِس مے کدۂ ہزار شیوہ و رنگ میں ہر گرفتارِ دامِ تخیّل نے اپنی خود فراموشیوں کے لیے کوئی نہ کوئی جامِ سرشاری سامنے رکھ لیا ہے اور اُسی میں بے خود رہتا ہے :

ساقی بہ ہمہ بادہ زیک خُم دہد ، امّا
در مجلسِ او مستیِ ہر یک ز شرابے ست

کوئی اپنا دامن پھولوں سے بھرنا چاہتا ہے ، کوئی کانٹوں سے ، اور دونوں میں سے کوئی بھی پسند نہیں کرے گا کہ تہی دامن رہے ۔ جب لوگ کامجوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چُن رہے تھے ، تو ہمارے حصّے میں تمنّاؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے ۔ اُنھوں نے پھول چُن لیے اور کانٹے چھوڑ دیے ۔ ہم نے کانٹے چُن لیے اور پھول چھوڑ دیے :

زخارزارِ محبّت دلِ ترا چہ خبر؟
کہ گُل بہ جیب نہ گنجد قبائے تنگِ ترا

ابوالکلام

(۷)

قلعۂ احمد نگر

۱۵ر اگست ۱۹۴۲ء

مارا زبانِ شکوہ زبیدادِ چرخ نیست
از ما خطے بہ مہرِ خموشی گرفتہ اند

صدیقِ مکرم

وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے۔ صراحی لبریز ہے اور جام آمادہ۔ ایک دَور ختم کر چکا ہوں۔ دوسرے کے لیے ہاتھ بڑھا رہا ہوں!

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل ست
صراحیِ مے ناب و سفینۂ غزل ست
جریدہ رو کہ گذرگاہِ عاقبت تنگ ست
پیالہ گیر کہ عمرِ عزیز بے بدل ست

طبیعت وقت کی کشاکش سے یک قلم فارغ اور دل فکرِ این و آں سے بکلّی آسودہ ہے اپنی حالت دیکھتا ہوں تو وہ عالم دکھائی دیتا ہے جس کی خبر خواجہ شیراز نے چھ سو سال پہلے دے دی تھی۔ زندگی کے چالیس سال طرح طرح کی کاوشوں میں بسر ہو گئے۔ مگر اب دیکھا تو معلوم ہوا کہ ساری کاوشوں کا حل اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ صبح کا جانفزا وقت ہو، اور چین کی بہترین چائے کے پے در پے فنجان!

چل سال رنج و غصہ کشیدیم و عاقبت
تدبیر ما بدستِ شراب دو سالہ بود

آج تین بجے سے کچھ پہلے آنکھ کھل گئی تھی۔ صحن میں نکلا، تو ہر طرف سناٹا تھا، صرف احاطہ کے باہر سے پہرہ دار کی گشت و بازگشت کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہاں رات کو احاطہ کے اندر وارڈروں کا تین تین گھنٹے کا پہرہ لگا کرتا ہے مگر بہت کم جاگتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اُس وقت بھی سامنے کے برآمدے میں ایک وارڈر کمبل بچھائے لیٹا تھا اور زور سے خراٹے لے رہا تھا بے اختیار مومن کا شعر یاد آگیا۔

ہے اعتماد مے بختِ خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کے لیے

زندانیوں کے اس قافلہ میں کوئی نہیں جو سحر خیزی کے معاملہ میں میرا شریکِ حال ہو سب بے خبر سو رہے ہیں، اور اسی وقت میٹھی نیند کے مزے لیتے ہیں:

دائم کسے بقافلہ بودست پاسباں
بیدار شو کہ چشم رفیقاں بخواب شد

سوچتا ہوں تو زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اس معاملہ میں بھی ساری دنیا سے الٹی ہی چال میرے حصے میں آئی۔ دنیا کے لیے سونے کا جو وقت سب سے بہتر ہوا، وہی میرے لیے بیداری کی اصلی پونجی ہوئی۔ لوگ ان گھڑیوں کو اس لیے عزیز رکھتے ہیں کہ میٹھی نیند کے مزے لیں۔ میں اس لیے عزیز رکھتا ہوں کہ بیداری کی تلخ کامیوں سے لذت یاب ہوتا رہوں۔

خلق را بیدار باید بود ز آب چشم من
دیں عجب کاں دم کہ می گریم کسے بیدار نیست

ایک بڑا فائدہ اس عادت سے یہ ہوا کہ میری تنہائی میں اب کوئی خلل نہیں ڈال سکتا میں نے دنیا کو ایسی جرأتوں کا سرے سے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ جب جاگتی ہے تو میں سو رہتا ہوں، جب سو جاتی ہے تو اُٹھ بیٹھتا ہوں:

خواب غفلت ہمہ را بُردہ و بیدار یکے ست

خلائق کے کتنے ہی ہجوم میں ہوں، لیکن اپنا وقت صاف بچا لے جاتا ہوں کیوں کہ میری اس خلوت در انجمن پر کوئی ہاتھ ڈال ہی نہیں سکتا۔ میرے عیش و طرب کی بزم اُس وقت آراستہ ہوتی ہے، جب نہ کوئی آنکھ دیکھنے والی ہوتی ہے، نہ کوئی کان سننے والا۔ رضی دانش نے میری زبان سے کہا تھا:

خوش زمزمۂ گوشۂ تنہائی خویشم
از جوش و خروش گل و بلبل خبرم نیست

اک بڑا فائدہ اس سے یہ ہوا کہ دل کی انگیٹھی ہمیشہ گرم رہنے لگی۔ صبح کی اس مہلت میں تھوڑی سی آگ جو سلگ جاتی ہے، اُس کی چنگاریاں بجھنے نہیں پاتیں، راکھ کے تلے دبی دبائی کام کرتی رہتی ہیں:

ازاں بہ دیرِ مغانم عزیز می دارند
کہ آتشے کہ نمیرد ہمیشہ در دلِ ماست

دن بھر اگر سوز و تپش کا سامان نہ بھی ملے، جب بھی چولھے کے ٹھنڈے پڑ جانے کا اندیشہ نہ رہا۔ عرفی کیا خوب بات کہہ گیا ہے:

سینۂ گرم نہ داری مطلب صحبتِ عشق
آتشے نیست چو در مجمرہ ات عُود مخر

اس سحر خیزی کی عادت کے لیے والد مرحوم کا منّت گزار ہوں ان کا معمول تھا کہ رات کی پچھلی پہر ہمیشہ بیداری میں بسر کرتے۔ بیماری کی حالت بھی اس معمول میں فرق نہیں ڈال سکتی تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ رات کو جلد سونا اور صبح جلد اٹھنا زندگی کی عادت کی پہلی علامت ہے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے کے حالات سناتے کہ دہلی میں مفتی صدر الدین مرحوم سے صبح کی سنّت و فرض کے درمیان سبق لیا کرتا تھا اور اس امتیاز پر نازاں رہتا تھا کیوں کہ وہ چاہتے تھے، مجھے خصوصیّت کے ساتھ اوروں سے علیحدہ سبق دیں، اور اس کے لیے صرف وہی وقت نکل سکتا تھا۔ یہ بھی فرماتے کہ یہ

فیض مجھے اپنے نانا رکن المدرسین سے ملا۔ وہ بھی شاہ عبدالعزیز سے علی الصّباح سبق لیا کرتے تھے اور پچھلی پہر سے اُٹھ کر اس کی تیاری میں لگ جاتے تھے۔ پھر خواجۂ شیراز کا یہ مقطع ذوق لے لے کر پڑھتے:

مرو بخواب کہ حافظ بہ بارگاہِ قبول
ز وِردِ نیم شب و درسِ صبحگاہ رسید

میری ابھی دس گیارہ سال کی عمر ہوگی کہ یہ باتیں کام کر گئی تھیں۔ بچپنے کی نیند سر پر سوار رہتی تھی، مگر میں اس سے لڑتا رہتا۔ صبح اندھیرے میں اُٹھتا، اور شمعداں روشن کر کے اپنا سبق یاد کرتا۔ بہنوں سے منّتیں کیا کرتا تھا کہ صبح آنکھ کھلے، تو مجھے جگا دینا۔ وہ کہتی تھیں، یہ نئی شرارت کیا سوجھی ہے! اس خیال سے کہ میری صحت کو نقصان نہ پہنچے، والد مرحوم روکتے، لیکن مجھے کچھ ایسا شوق پڑ گیا تھا کہ جس دن دیر سے آنکھ کھلتی، دن بھر پشیمان سا رہتا۔ آنے والی زندگی میں جو معاملات پیش آنے والے تھے، یہ ان سے میرا پہلا سابقہ تھا:

اتانی ھواھا قبل ان اعرف الھویٰ
فصادف قلبًا فارغًا فتمکنا

دیکھیے، یہاں "پہلا سابقہ" لکھتے ہوئے میں نے عربی کی ترکیب کان اول عھدی بھا کا بلا قصد ترجمہ کر دیا کہ دماغ میں بسی ہوئی تھی۔ یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور عالمِ تنہائی کی خلوت اندوزیوں کا پورا پورا لطف اٹھا رہا ہوں۔ گویا ساری دنیا میں اس وقت میرے سوا کوئی نہیں بستا۔ کہہ نہیں سکتا، تنہائی کا یہ احساس میری طبعِ خلوت پرست کی جولانیوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا کرتا ہے۔ بیدل کی خیال بندیوں کا غلو بے کیف ہو، لیکن اس کی بحرِ طویل کی بعض غزلیں کیف سے خالی نہیں ہیں:

ستم ست گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ، درِ دل کشا، بہ چمن درآ

پے نادہائے خجستہ بو، پسند زحمت جستجو
بخیالِ حلقۂ زلفِ اُو گرہے خورد بہ ختن درآ

پانچ بجے سے قلعہ میں ٹینکوں کے چلانے کی مشق شروع ہوتی ہے اور گھڑگھڑ کی آواز آنے لگتی ہے، مگر اس میں ابھی دیر ہے۔ چار بجے دودھ کی لاری آتی ہے اور چند لمحوں کے لیے صبح کا سکون ہنگامہ سے بدل دیتی ہے۔ وہ ابھی چند منٹ ہوئے، آئی تھی اور واپس گئی۔ اگر اس وقت کے سناٹے میں کوئی آواز مخل ہو رہی ہے تو وہ صرف جواہر لال کے ہلکے خراٹوں کی آواز ہے۔ وہ ہمسایہ میں سو رہے ہیں، صرف لکڑی کا ایک پردہ حائل ہے۔ خراٹے جب تھمتے ہیں تو حسب معمول نیند میں بڑبڑانے لگتے ہیں۔ یہ بڑبڑانا ہمیشہ انگریزی میں ہوتا ہے:

یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم

مؤمن الدولہ اسحاق خان شوستری محمد شاہی امراء میں سے تھا، اس کا ایک مطلع آپ نے تذکروں میں دیکھا ہوگا، ضلع جگت کی صنعت گری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مگر جب کبھی جواہر لال کو انگریزی میں بڑبڑاتے سنتا ہوں، تو بے اختیار یاد آجاتا ہے:

زبسکہ در دل تنگم خیالِ آں گل بود
نفیرِ خوابِ من امشب صفیرِ بلبل بود

نیند میں بڑبڑانے کی حالت بھی عجیب ہے۔ یہ عموماً انہی طبیعتوں پر طاری ہوتی ہے، جن میں دماغ سے زیادہ جذبات کام کیا کرتے ہیں۔ جواہر لال کی طبیعت بھی سرتاسر جذباتی واقع ہوئی ہے، اس لیے خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں جذبات کام کرتے رہتے ہیں۔

یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ سے زیادہ ہوگیا ہے۔ فوجی صیغہ نے ہمارا چارج لے لیا، داخلہ کے وقت فہرست سے مقابلہ کرلیا، ہماری حفاظت کا اور دنیا سے بے تعلقی کا جس قدر بندوبست کیا جاسکتا تھا، وہ بھی کرلیا، لیکن اس سے زیادہ ہمارے

معاملات سے انھیں کوئی سروکار معلوم نہیں ہوتا۔ اندر کا تمام انتظام گورنمنٹ بمبئی کے ہوم ڈیپارٹمنٹ نے براہ راست اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور اصلی رشتہ کار مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔

ہمیں یہاں رکھنے کے لیے جو ابتدائی انتظام کیا گیا تھا، وہ یہ تھا کہ گرفتاری سے ایک دن پہلے یعنی ۸ر اگست کو یروداسنٹرل جیل پونا سے ایک سینیر جیلر یہاں بھیج دیا گیا۔ دس جیل کے وارڈرز اور پندرہ قیدی کام کاج کے لیے اس کے ساتھ آئے۔ جیلر کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کیا صورت حال پیش آنے والی ہے، صرف اتنی بات بتلائی گئی تھی کہ ایک ڈیٹینشن کیمپ (Detention camp) کھل رہا ہے: چند دنوں کے لیے دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ ہم پہنچے، تو معاملہ ایک دوسری ہی شکل میں نمایاں ہوا، اور بیچارہ سراسیمہ ہو کر رہ گیا۔ چونکہ میں نے یہاں آتے ہی اپنا غصہ اُس غریب پر نکالا تھا، اس لیے کئی دن تک منھ چھپائے پھرتا رہا۔ جب اور کچھ نہ بنتی، تو ضلع کے کلکٹر کے پاس دوڑا ہوا جاتا، وہ اس سے زیادہ بے خبر تھا۔

درِ ہر کس کہ زدم، بے خبر و غافل بود

دوسرے دن کلکٹر اور سول سرجن آئے اور معذرت کر کے چلے گئے۔ سول سرجن ہر شخص کا سینہ ٹھونک بجا کر دیکھتا رہا کہ کیا آواز نکلتی ہے! معلوم نہیں پھیپھڑوں کی حالت معلوم کرنا چاہتا تھا یا دلوں کی۔ مجھ سے بھی معائنہ کی درخواست کی۔ میں نے کہا: میرا سینہ دیکھنا بے سود ہے، اگر دماغ کے دیکھنے کا کوئی آلہ ساتھ ہے، تو اُسے کام میں لائیے۔

بگذر مسیح، از سرِ ما کُشتگانِ عشق
یک زندہ کردن تو بہ صد خوں برابرست

بہر حال چوتھے دن انسپکٹر جنرل آف پریزن آیا، اور گورنمنٹ کے احکام کا پرچہ حوالہ کیا: کسی سے ملاقات نہیں کی جا سکتی، کسی سے خط و کتابت نہیں کی جا سکتی، کوئی اخبار نہیں آسکتا؛ ان باتوں کے علاوہ اگر کسی اور بات کی شکایت ہو تو حکومت اُس پر غور کرنے کے لیے۔

تیار ہے۔ اب ان باتوں کے بعد اور کون سی بات رہ گئی تھی، جس کی شکایت کی جاتی اور حکومت ازراہِ عنایت اسے دُور کر دیتی!

زباں جلائی، کیے قطع ہاتھ پہنچوں سے
یہ بندوبست ہوئے ہیں مری دعا کے لیے

انسپکٹر جنرل نے کہا۔ اگر آپ کتابیں یا کوئی اور سامان منگوانا چاہیں، تو ان کی فہرست لکھ کر مجھے دے دیں، گورنمنٹ اپنے طور پر منگوا کر آپ کو پہنچا دے گی۔ چونکہ گرفتاری سفر کی حالت میں ہوئی تھی، اس لیے میرے پاس دو کتابوں کے سوا جو راہ میں دیکھنے کے لیے ساتھ رکھ لی تھیں، مطالعہ کا کوئی سامان نہ تھا۔ خیال ہوا، اگر مکان سے بعض مسودات اور کچھ کتابیں آجائیں، تو قید و بند کی یہ فرصت کام میں لائی جائے۔ بظاہر اس خواہش میں کوئی برائی معلوم نہیں ہوئی۔ دنیا را بہ امید خوردہ اند، آرزو عیب ندارد!

نقاب چہرۂ امید باشد گرد نومیدی
غبارِ دیدۂ یعقوب آخر توتیا گردد

میں نے مطلوبہ اشیاء کا ایک پرچہ لکھ کر اس کے حوالہ کیا اور وہ لے کر چلا گیا۔ لیکن اس کے جانے کے بعد جب صورت حال پر زیادہ غور کرنے کا موقع ملا، تو طبیعت میں ایک خلش سی محسوس ہونے لگی۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی دراصل طبیعت کی ایک کمزوری تھی کہ حکومت کی اس رعایت سے فائدہ اٹھانے پر راضی ہو گئی۔ جب عزیز و اقربا سے بھی ملنے اور خط و کتابت کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، جس کا حق مجرموں اور قاتلوں تک سے چھینا نہیں جاتا، تو پھر یہ توقع کیوں رکھی جائے کہ وہی حکومت گھر سے سامان منگوا کر فراہم کر دے گی! ایسی حالت میں عزتِ نفس کا تقاضا صرف یہی ہو سکتا ہے کہ نہ تو کوئی آرزو کی جائے، نہ توقع رکھی جائے:

زتیغ بے نیازی ناتوانی، قطع ہستی کن
فلک تا افگند از پا ترا، خود پیش دستی کن

میں نے دوسرے ہی دن انسپکٹر جنرل کو خط لکھ دیا کہ فہرست کا پرچہ واپس کر دیا جائے، جب تک گورنمنٹ کا موجودہ طرزِ عمل قائم رہتا ہے، میں کوئی چیز مکان سے منگوانی نہیں چاہتا۔ یہاں اور تمام ساتھیوں نے بھی یہی طرزِ عمل اختیار کیا:

دامن اس کا تو بھلا دُور ہے اے دستِ جنوں
کیوں ہے بیکار، گریباں تو مرا دور نہیں!

اب چائے کے تیسرے فنجان کے لیے کہ ہمیشہ اس دَورِ صبوحی کا آخری جام ہوتا ہے، ہاتھ بڑھاتا ہوں اور یہ افسانہ سرائی ختم کرتا ہوں۔ یادش بخیر، خواجۂ شیراز کے پیرِ مے فروش کی موعظت بھی وقت پر کیا کام دے گئی ہے:

دی پیرِ مے فروش کہ ذکرش بخیر باد — گفتا: "شراب نوش و غمِ دل بہ بر ز یاد"
گفتم: "بباد می دہدم بادہ نام و ننگ" — گفتا: "قبول کن سخن و ہر چہ بادا باد"
"بے خار گل نہ باشد و بے نیش نوش ہم" — "تدبیر چیست؟ وضعِ جہاں ایں چنیں فتاد"
"پُر کن ز بادہ جام و دہادم بگوشِ ہوش
بشنو از و حکایتِ جمشید و کیقباد"

حکایت بادہ و تریاک

قلعۂ احمد نگر

۲۷ اگست ۱۹۴۲ء

صدیقِ مکرّم!

انسان اپنی ایک زندگی کے اندر کتنی مختلف زندگیاں بسر کرتا ہے۔ مجھے بھی اپنی زندگی کی دو قسمیں کر دینی پڑیں۔ ایک قید خانے کی باہر کی، ایک اندر کی:

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در اقلیم عشق
روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است

دونوں زندگیوں کے مرقعوں کی الگ الگ رنگ و روغن سے نقش آرائی ہوئی ہے۔ آپ شاید ایک کو دیکھ کر دوسری کو پہچان نہ سکیں۔

لباس صورت اگر واژگوں کنم، بیند
کہ خرقۂ خشنم مایۂ طلا باف است

قید سے باہر کی زندگی میں اپنی طبیعت کی افتاد بدل نہیں سکتا۔ خود رفتگی اور خود مشغولی مزاج پر چھائی رہتی ہے۔ دماغ اپنی فکروں سے باہر آنا نہیں چاہتا، اور دل اپنی نقش آرائیوں کا گوشہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بزم و انجمن کے لیے بارِ خاطر نہیں ہوتا۔ لیکن یارِ شاطر بھی بہت کم بن سکتا ہوں۔

تا کے چو موجِ بحر بہ ہر سو شتافتن
در عینِ بہر پائے چو گرداب بند کن

لیکن جوں ہی حالات کی رفتار قید و بند کا پیام لاتی ہے، میں کوشش کرنے لگتا ہوں کہ اپنے آپ کو یک قلم بدل دوں۔ میں اپنا پچھلا دماغ سر سے نکال دیتا ہوں اور ایک نئے

دِماغ سے اُس کی خالی جگہ بھرنی چاہتا ہوں۔ حریمِ دِل کے طاقوں کو دیکھتا ہوں کہ خالی ہو گئے تو کوشش کرتا ہوں کہ نئے نئے نقش و نگار بناؤں اور اُنھیں پھر سے آراستہ کر دوں۔

وقتست دِگر بُت کدہ سازند حرم را

اِس تحوّلِ صورت (METAMORPHISN) کے عمل میں کہاں تک مجھے کامیابی ہوتی ہے، اِس کا فیصلہ تو دوسروں کی نگاہیں ہی کر سکیں گی، لیکن خود میرے فریبِ حال کے لیے اِتنی کامیابی بس کرتی ہے کہ اکثر اوقات اپنی پچھلی زندگی کو بھولا رہتا ہوں، اور جب تک اُس کے سُراغ میں نہ نکلوں، اُسے واپس نہیں لا سکتا:

دِل کہ جمع است، غم از بے سروسامانی نیست
فکرِ جمعیت اگر نیست پریشانی نیست

اگر آپ مجھے اُس عالم میں دیکھیں تو خیال کریں، میری پچھلی زندگی مجھے قید خانے کے دروازے تک پہنچا کر واپس چلی گئی، اور اب ایک دوسری ہی زندگی سے سابقہ پڑا ہے۔ جو زندگی کل تک اپنی حالتوں میں گُم، اور خوش کامیوں اور دِل شگفتگیوں سے بہت کم آشنا تھی، آج اچانک ایک ایسی زندگی کے قالب میں ڈھل گئی جو شگفتہ مزاجیوں اور خندہ رُوئیوں کے سوا اور کسی بات سے آشنا ہی نہیں۔ 'ہر وقت خوش رہو اور ہر ناگوار حالت کو خوش گوار بناؤ' جس کا دستور العمل ہے۔

حاصلِ کارگہِ کون و مکاں ایں ہمہ نیست
بادہ پیش آر کہ اسباب جہاں ایں ہمہ نیست
پنج روزے کہ دریں مرحلہ مُہلت داری
خوش بیاسائے زمانے کہ زماں ایں ہمہ نیست

مَیں نے قید خانہ کی زندگی کو دو مُتضاد فلسفوں سے ترکیب دی ہے۔ اِس میں ایک جُز رواقیہ (STOICS) کا ہے ایک لذّتیہ (EPICUREANS) کا۔

پُنبہ را آشتی ایں جا بہ شرار اُفتاد است

جہاں تک حالات کی ناگواریوں کا تعلق ہے، رواقیت سے اُن کے زخموں پر مرہم لگاتا ہوں، اور اُن کی چبھن بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں:

ہر وقت بد کہ روئے دہد آبِ سیل واں
ہر نقشِ خوش کہ جلوہ کند، موجِ آب گیر

جہاں تک زندگی کی خوش گواریوں کا تعلق ہے، لذتیہ کا زاویۂ نگاہ کام میں لاتا ہوں، اور خوش گوار رہتا ہوں:

ہر وقت خوش کہ دست دہد، مُغتنم شمار
کس را وقوف نیست کہ انجام کار چیست

میں نے اپنے کاک تیل (COKTAIL) کے جام میں دونوں بوتلیں اونڈیل دیں۔ میرا ذوقِ بادہ آشامی بغیر اِس جامِ مُرکّب کے تسکین نہیں پا سکتا تھا۔ اِسے قدیم تعبیر میں یوں سمجھیے کہ گویا حکایت بادہ و تریاک میں نے تازہ کر دی ہے:

چناں افیون ساقی درمے افگند
حریفاں را نہ سر ماند و نہ دستار

البتّہ کاک تیل کا یہ نُسخۂ خاص ہر خامکار کے بس کی چیز نہیں ہے۔ صِرف بادہ گُساران کُہن مشق ہی اِسے کام میں لا سکتے ہیں۔ ورموتھ (VERMOUTH) اور جن (GIN) کا مرکّب پینے والے اِس رطلِ گِراں کے مُتحمّل نہیں ہو سکیں گے۔ مولانائے روم نے ایسے ہی معاملات کی طرف اِشارہ کیا تھا:

بادۂ آں در خورِ ہر ہوش نیست
حلقۂ آں سخرۂ ہر گوش نیست

آپ کہیں گے، قید خانہ کی زندگی رواقیت کے لیے تو موزوں ہوئی کہ زندگی کے رنج و راحت سے بے پروا بنا دینا چاہتی ہے، لیکن لذتیہ کی عشرت اندوزیوں کا وہاں کیا موقع ہُوا؟۔ جو نامُراد قید خانے سے باہر کی آزادیوں میں بھی زندگی کی عیش کوشیوں سے تہی دست رہتے

ہیں، انھیں قید و بند کی محروم زندگی میں اس کا سر و سامان کہاں میسر آسکتا ہے؟ لیکن میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ انسان کا اصلی عیش دماغ کا عیش ہے، جسم کا نہیں۔ میں لذتیہ سے اُن کا دماغ لے لیتا ہوں، جسم اُن کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ داغ مرحوم نے ناصح سے صرف اُس کی زبان لینی چاہی تھی:

ملے جو حشر میں، لے لوں زبان ناصح کی
عجیب چیز ہے یہ طولِ مدعا کے لیے

اور غور کیجیے تو یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہی ہے کہ سر و سامانِ کار ہمیشہ اپنے سے باہر ڈھونڈھتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردۂ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے کہ وہ ہم سے باہر نہیں ہے، خود ہمارے اندر ہی موجود ہیں۔ عیش و مسرت کی جن گل شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈھتے ہیں اور نہیں پاتے، وہ ہمارے نہاں خانۂ دل کے چمن زاروں میں ہمیشہ کھلتے اور مرجھاتے رہتے ہیں، لیکن محرومی ساری یہ ہوئی کہ ہمیں چاروں طرف کی خبر ہے مگر خود اپنی خبر نہیں۔ وفی انفسکم افلا تبصرون ٥

کہیں تجھ کو نہ پایا، گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈھا
پھر آخر دل ہی میں پایا، بغل ہی میں سے تو نکلا

جنگل کے مور کو کبھی باغ و چمن کی جستجو نہیں ہوئی۔ اُس کا چمن خود اُس کی بغل میں موجود رہتا ہے۔ جہاں کہیں اپنے پر کھول دے گا ایک چمنستانِ بوقلموں کھل جائے گا۔

نہ با صحرا سرے دارم نہ با گلزار سودائے
بہ ہر جا می روم، از خویش می جوشد تماشائے

قید خانے کی چار دیواری کے اندر بھی سورج ہر روز چمکتا ہے، اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی اور غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا۔ اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں، تو وہ صرف قید خانے کے باہر ہی نہیں چمکتیں، اسیرانِ قید و محن کو بھی اپنی جلوہ فروشیوں کا پیام بھیجتی رہتی ہیں۔ صبح جب طباشیر بکھیرتی ہوئی آئے گی، اور شام جب

شفق کی گلگوں چادریں پھیلانے لگے گی، تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں ہی سے اُن کا نظارہ نہیں کیا جائے گا، قید خانے کے روزنوں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انھیں دیکھ لیا کریں گی۔ فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شادکام رکھے، کسی کو محروم کر دے۔ وہ جب کبھی اپنے چہرہ سے نقاب اُلٹتی ہے، تو سب کو یکساں طور پر نظارۂ حُسن کی دعوت دیتی ہے یہ ہماری غفلت اندیشی ہے کہ نظر اُٹھا کر دیکھتے نہیں اور صرف اپنے گرد و پیش ہی میں کھوئے رہتے ہیں۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں، کبھی چاندنی کی حُسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام چہکیں، اُسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے؟ یہاں سر و سامانِ کار کی تو اتنی فراوانی ہوئی کہ کسی گوشہ میں بھی گم نہیں ہو سکتا۔ مصیبت ساری یہ ہے کہ خود ہمارا دل و دماغ ہی گم ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے سے باہر ساری چیزیں ڈھونڈھتے رہیں گے، مگر اپنے کھوئے ہوئے دل کو کبھی نہیں ڈھونڈھیں گے، حالاں کہ اگر اُسے ڈھونڈھ نکالیں، تو عیش و مسرت کا سارا سامان اسی کوٹھری کے اندر سمٹا ہوا مل جائے۔

بغیرِ دل ہمہ نقش و نگار بے معنی ست
ہمیں ورق کہ سیہ گشت مدعا ایں جاست

ایوان و محل نہ ہوں، تو کسی درخت کے سائے سے کام لے لیں۔ دیبا و مخمل کا فرش نہ ملے، تو سبزۂ خودرو کے فرش پر جا بیٹھیں۔ اگر برقی روشنی کے کنول میسر نہیں، تو آسمان کی قندیلوں کو کون بجھا سکتا ہے۔ اگر دُنیا کی ساری مصنوعی خوش نمائیاں اوجھل ہو گئی ہیں تو ہو جائیں، صبح اب بھی ہر روز مسکرائے گی، چاندنی اب بھی ہمیشہ جلوہ فروشیاں کرے گی۔ لیکن اگر دلِ زندہ

پہنوں میں نہ رہے، تو خدارا بتلائیے! اُس کا بدل کہاں ڈھونڈھیں؟ اُس کی خالی جگہ بھرنے کے لیے کس چولھے کے انگارے کام دیں گے؟

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ! تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

مَیں آپ کو بتلاؤں، اِس راہ میں میری کامرانیوں کا راز کیا ہے! مَیں اپنے دِل کو مرنے نہیں دیتا۔ کوئی حالت ہو، کوئی جگہ ہو، اُس کی تڑپ کبھی دھیمی نہیں پڑے گی۔ مَیں جانتا ہوں کہ جہانِ زندگی کی ساری رونقیں اِسی مے کدۂ خلوت کے دم سے ہیں۔ یہ اُجڑا اور ساری دنیا اُجڑ گئی۔

از صد سخنِ پیرم یک حرف مرا یاد ست
عالم نہ شود ویراں، تا مے کدہ آباد ست

باہر کے ساز و سامانِ عشرت مجھ سے چھن جائیں، لیکن جب تک یہ نہیں چھنتا، میرے عیش و طرب کی سرمستیاں کون چھین سکتا ہے؟

دیدمش خرم و خنداں قدحِ بادہ بدست
واندراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد
گفتم ایں جامِ جہاں بیں بتو کے داد حکیم؟
گفت آں روز کہ ایں گنبدِ مینا می کرد

آپ کو معلوم ہے کہ مَیں ہمیشہ صبح تین سے چار بجے کے اندر اُٹھتا ہوں، اور چائے کے پیہم فنجانوں سے جامِ صبوحی کا کام لیا کرتا ہوں۔ خواجۂ شیراز کی طرح میری صدائے حال بھی یہ ہوتی ہے کہ:

خورشیدِ مے ز مشرقِ ساغر طلوع کرد
گر برگِ عیش می طلبی، ترکِ خواب کن

یہ وقت ہمیشہ میرے اوقاتِ زندگی کا سب سے زیادہ پُر کیف وقت ہوتا ہے، لیکن قید خانے کی زندگی میں تو اِس کی سرمستیاں اور خود فراموشیاں ایک دوسرا ہی عالم پیدا کر دیتی ہیں۔ یہاں

کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا، جو اُس وقت خواب آلود آنکھیں لیے ہوئے اُٹھے، اور قرینے سے چائے بنا کر میرے سامنے دھر دے۔ اِس لیے خود اپنے ہی دستِ شوق کی سرگرمیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں اُس وقت بادۂ کُہن کے شیشہ کی جگہ چینی چائے کا تازہ ڈبا کھولتا ہوں، اور ایک ماہرِ فن کی دقیقہ سنجیوں کے ساتھ چائے دم دیتا ہوں۔ پھر جام و صراحی کو میز پر داہنی طرف جگہ دوں گا، کہ اُس کی اوّلیت اِسی کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا کہ سروسامانِ کار میں اُن کی جگہ دوسری ہوئی۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاؤں گا، اور کچھ نہ پوچھیے کہ بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جاؤں گا۔ کسی بادہ گسار نے شامپین اور بورڈو کے صد سالہ تہ خانوں کے عرقِ کُہن سال میں بھی وہ کیف و سرور کہاں پایا ہوگا، جو چائے کے اِس دورِ صبح گاہی کا ہر گھونٹ میرے لیے مہیا کر دیتا ہے:

ما در پیالہ عکسِ رُخِ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذتِ شُربِ مدام ما

آپ کو معلوم ہے کہ میں چائے کے لیے روسی فنجان کام میں لاتا ہوں۔ یہ چائے کی معمولی پیالیوں سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر بے ذوقی کے ساتھ پیجیے تو دو گھونٹ میں ختم ہو جائیں مگر خدانخواستہ میں ایسی بے ذوقی کا مرتکب کیوں ہونے لگا۔ میں جرعہ کشانِ کُہن مشق کی طرح ٹھہر ٹھہر کر پیوں گا، اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لوں گا، پھر جب پہلا فنجان ختم ہو جائے گا، تو کچھ دیر کے لیے رُک جاؤں گا، اور اِس درمیانی وقفہ کو امتدادِ کیف کے لیے جتنا طول دے سکتا ہوں طول دوں گا، پھر دوسرے اور تیسرے کے لیے ہاتھ بڑھاؤں گا، اور دُنیا کو اور اُس کے سارے کارخانۂ سود و زیاں کو یک قلم فراموش کر دوں گا:

خوشتر از فکرِ مے و جام چہ خواہد بودن
تا بہ بینم، سرِ انجام چہ خواہد بودن

اِس وقت بھی کہ یہ سطریں بے اختیار نوکِ قلم سے نکل رہی ہیں، اُسی عالم میں ہوں، اور نہیں جانتا کہ ۹ اگست کی صبح کے بعد سے دُنیا کا کیا حال ہوا؟ اور اب کیا ہو رہا ہے،

شرابِ تلخ دہ ساقی ! کہ مرد افگن بود زورش
کہ تا یک دم بیاسائم ز دُنیا و شر و شورش
کمندِ صیدِ بہرامی بیفگن ، جامِ مے بردار
کہ من پیمودم ایں صحرا، نہ بہرام ست نے گورش

میرا دوسرا پُر کیف وقت دوپہر کا ہوتا ہے، یا زیادہ صحتِ تعیّن کے ساتھ کہوں کہ زوال کا ہوتا ہے۔ لکھتے لکھتے تھک جاتا ہوں، تو تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاتا ہوں، پھر اُٹھتا ہوں، غسل کرتا ہوں، چائے کا دَور تازہ کرتا ہوں، اور تازہ دم ہو کر پھر اپنی مشغولیتوں میں گُم ہو جاتا ہوں۔ اُس وقت آسمان کی بے داغ نیلگونی اور سورج کی بے نقاب درخشندگی کا جی بھر کے نظارہ کروں گا، اور رُواقِ دِل کا ایک ایک دریچہ کھول دوں گا، گوشہ ہائے خاطرِ افسردگیوں اور گرفتگیوں سے کتنے ہی غبار آلود ہوں، لیکن آسمان کی کُشادہ پیشانی اور سورج کی چمکتی ہوئی خندہ روئی دیکھ کر ممکن نہیں کہ اچانک روشن نہ ہو جائیں۔

بازم بہ کلبہ کیست ؟ نہ شمع و نہ آفتاب
بام و درم ز ذرّہ و پروانہ پُر شدہ ست

لوگ ہمیشہ اِس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لیے کام میں لائیں۔ لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہوئی، یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا، یہاں اِس سے زیادہ سہل کوئی کام نہ ہُوا کہ مر جائیے، اور اِس سے زیادہ مُشکل کوئی کام نہ ہُوا کہ زندہ رہیے۔ جس نے یہ مُشکل حل کر لی، اُس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا:

ناصحم گفت کہ جُز غم چہ ہُنر دارد عشق
گُفتم اے خواجۂ عاقل ! ہُنرے بہتر ازیں

غالباً قدیم چینیوں نے زندگی کے مسئلہ کو دوسری قوموں سے بہتر سمجھا تھا۔ ایک پُرانے چینی مقولہ میں سوال کیا گیا ہے "سب سے زیادہ دانش مند آدمی کون ہے؟" پھر جواب دیا ہے

"جو سب سے زیادہ خوش رہتا ہے"۔ اِس سے ہم چینی فلسفۂ زندگی کا زاویۂ نگاہ معلوم کر لے سکتے ہیں، اور اِس میں شک نہیں کہ یہ بالکل سچ ہے:

نہ ہر درخت تحمّل کُند جفائے خزاں
غلامِ ہمتِ مردم کہ ایں قدم دارد

اگر آپ نے یہاں ہر حال میں خوش رہنے کا ہُنر سیکھ لیا ہے، تو یقین کیجیے، زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا۔ اب اِس کے بعد اِس سوال کی گُنجائش ہی نہیں رہی، کہ آپ نے اور کیا کیا سیکھا؟ خود بھی خوش رہیے اور دوسروں سے بھی کہتے رہیے کہ اپنے چہروں کو غمگین نہ بنائیں۔

چو مہمانِ خراباتی بہ عشرت باش با رنداں
کہ دردِ سرکشی جاناں، گر ایں مستی خُمار آرد

زمانۂ حال کے ایک فرانسیسی اہلِ قلم آندرے ژید (ANDRE GIDE) کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی، جو اُس نے اپنی خود نوشتہ سوانح میں لکھی ہے: خوش رہنا محض ایک طبعی اِحتیاج ہی نہیں ہے، بلکہ ایک اخلاقی ذمّہ داری ہے۔ یعنی ہماری اِنفرادی زندگی کی نوعیت کا اثر صرف ہم ہی تک محدود نہیں رہتا۔ وہ دوسروں تک بھی متعدی ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ ہماری ہر حالت کی چھوت دوسروں کو بھی لگتی ہے، اِس لیے ہمارا اخلاقی فرض ہُوا کہ خود افسُردہ خاطر ہو کر دوسروں کو افسُردہ خاطر نہ بنائیں۔

افسُردہ دِل افسُردہ کُند انجمنے را

ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ہر چہرے کا عکس بیک وقت سیکڑوں آئینوں میں پڑنے لگتا ہے۔ اگر ایک چہرے پر غُبار آجائے گا، تو سیکڑوں چہرے غُبار آلود ہو جائیں گے ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک اِنفرادی واقعہ نہیں ہے۔ وہ پورے مجموع کا حادثہ ہے۔ دریا کی سطح پر ایک لہر تنہا اُٹھتی ہے، لیکن اُسی ایک لہر سے بے شُمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں یہاں ہماری کوئی بات بھی صرف ہماری نہیں ہوئی۔ ہم جو کچھ اپنے لیے کرتے ہیں، اُس میں بھی

دوسروں کا حصّہ ہوتا ہے۔ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کر سکے گی، اگر ہمارے چاروں طرف غمناک چہرے اکٹھے ہو جائیں گے۔ ہم خود خوش رہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں، اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خود خوش ہونے لگتے ہیں۔ یہی حقیقت ہے جسے عُرفی نے اپنے شاعرانہ پیرایہ میں ادا کیا تھا:

بہ دیدارِ تو دِل شادند باہم دوستانِ تو
ترا ہم شادماں خواہم، چو روئے دوستاں بینی

یہ عجیب بات ہے کہ مذہب، فلسفہ اور اخلاق — تینوں نے زندگی کا مسئلہ حل کرنا چاہا، اور تینوں میں خود زندگی کے خلاف رُجحان پیدا ہو گیا۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ایک آدمی جتنا زیادہ بُجھا دِل اور سوکھا چہرہ لے کر پھرے گا، اُتنا ہی زیادہ مذہبی، فلسفی اور اخلاقی قسم کا ہوگا۔ گویا علم اور تقدّس دونوں کے لیے یہاں ماتمی زندگی ضروری ہوئی۔ زندگی کی تحقیر اور توہین صرف یونان کے کلبیہ (CYNICS) ہی کا شعار نہ تھا، بلکہ رواقی (STOICS) اور مشائی (PERIPATETICS) نقطۂ نگاہ میں بھی اِس کے عناصر برابر کام کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ افسردہ دِلی اور ترش روئی فلسفیانہ مزاج کا ایک نمایاں خط و خال بن گئی۔ اخلاق سے اگر اُس کے مذہبِ طمانیت و مسرّت (EUDIMONISM) اور مادیاتی مذہبِ عشرت (HEDONISM) کے تصوّرات مُستثنیٰ کر دیجیے، تو اُس کا عام طبعی مزاج بھی فلسفیانہ سرکہ روئی سے خالی نہیں ملے گا۔ مذہب اور روحانیت کی دُنیا میں تو زُہدِ خشک اور طبعِ خنک کی اِتنی گرم بازاری ہوئی کہ اب زُہد مزاجی اور حق آگاہی کے ساتھ کسی ہنستے ہوئے چہرے کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا۔ دین داری اور ثقالتِ طبع تقریباً مُرادف لفظ بن گئے ہیں، یہاں تک کہ قاآنی کو کہنا پڑا تھا:

اسبابِ طرب را ببر از مجلس بیروں
زاں پیش کہ ناگاہ ثقیلے رسد از در

آپ جانتے ہیں کہ اہلِ ذوق کی مجلسِ طرب تنگ دِلوں کے گوشۂ خاطر کی طرح تنگ نہیں

ہوتی۔ اس کی وسعت میں بڑی سمائی ہے۔ نظامی گنجوی نے اس کی تصویر کھینچی تھی:

ہر چہ در جملہ بہ آفاق دریں جا حاضر
مومن و ارمنی و گبر و نصارا و یہود

لیکن اتنی سمائی ہونے پر بھی اگر کسی چیز کی وہاں گنجائش نہ نکل سکی، تو وہ زاہدانِ خشک کے ضخیم اور گنبد نما عمامے تھے۔ ایک عمامہ بھی پہنچ جاتا ہے، تو پوری مجلس تنگ ہو جاتی ہے اسی لیے بعض یارانِ بے تکلف کو کہنا پڑا تھا:

در مجلسِ ما زاہد! زنہار تکلف نیست
البتہ تو می گنجی، عمامہ نمی گنجد

یہ درست ہے کہ جن مسئلوں کو دنیا سیکڑوں برس کی کاوشوں سے بھی حل نہ کر سکی، آج ہم اپنی خوش طبعی کے چند لطیفوں سے انھیں حل نہیں کر دے سکتے۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں ایک حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فلسفی، ایک زاہد، ایک سادھو کا خشک چہرہ بنا کر ہم اس مرقع میں نہیں کھپ سکتے، جو نقاشِ فطرت کے موقلم نے یہاں کھینچ دیا ہے۔ جس مرقع میں سورج کی چمکتی ہوئی پیشانی، چاند کا ہنستا ہوا چہرہ، ستاروں کی چشمک، درختوں کا رقص، پرندوں کا نغمہ، آبِ رواں کا ترنم، اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہوں، اس میں ہم ایک بجھے ہوئے دل اور سوکھے ہوئے چہرہ کے ساتھ جگہ پانے کے یقیناً مستحق نہیں ہو سکتے۔ فطرت کی اس بزمِ نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دہکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو، اور جو چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر، ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر، پھولوں کی صف میں پھولوں کی طرح کھل کر اپنی جگہ نکال لے سکتی ہو۔ صائب کیا خوب کہہ گیا ہے:

دریں دو ہفتہ کہ چوں گل دریں گلستانی — کشادہ روے تر از راز ہاے مستاں باش
تمیز نیک و بدِ روزگار کارِ تو نیست — چو چشمِ آئینہ در خوب و زشت حیراں باش

ابوالکلام

قلعۂ احمد نگر

۱۱ر اپریل ۱۹۴۳ء

آنچہ دل از فکرِ آں می سوخت پیہم ہجر بود
آخر از بے مہریِ گردوں بآں ہم ساختیم

صدیقِ مکرّم :

اس وقت صبح کے چار نہیں بجے ہیں ، بلکہ رات کا پچھلا حصّہ شروع ہو رہا ہے۔ دس بجے حسبِ معمول بستر پر لیٹ گیا تھا ، لیکن آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوئیں۔ ناچار اُٹھ بیٹھا۔ کمرہ میں آیا ، روشنی کی اور اپنے اشغال میں ڈوب گیا۔ پھر خیال ہُوا ، قلم اُٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے جی کا بوجھ ہلکا کروں۔ اِن آٹھ مہینوں میں جو یہاں گزر چکے ہیں ، یہ چھٹی رات ہے جو اِس طرح گزر رہی ہے ، اور نہیں معلوم ابھی اور کتنی راتیں اِسی طرح گزریں گی۔

دِماغ بر فلک و دِل بہ پائے مہرِ بُتاں
چگونہ حرف زنم ؟ دل کجا ، دِماغ کجا

میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۱۹۴۱ء میں جب میں نینی جیل میں مقید تھا ، تو اِس خیال سے کہ میرے لیے تشویشِ خاطر کا موجب ہو گا ، مجھے اِطّلاع نہیں دی گئی۔ لیکن رہائی کے بعد معلوم ہُوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گزرا تھا۔ مجھے قید خانہ میں اُس کے خطوط ملتے رہے۔ اُن میں ساری باتیں ہوتی تھیں ، لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذِکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا ، تو اُن سب کی رائے تبدیلِ آب و ہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بہ ظاہر فائدہ ہُوا تھا ، جولائی میں واپس آئی تو صحت کی رونق چہرہ پر واپس آ رہی تھی۔

اِس تمام زمانے میں میں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اِس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مُہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ

دوسری منزل سامنے نمودار ہو گئی،

صد بیاباں بگزشت و دِگرے در پیش ست

جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ مَیں تین ہفتہ کے بعد کلکتہ واپس ہُوا، اَور پھر چار دِن کے بعد آل اِنڈیا کانگریس کمیٹی کے اِجلاسِ بمبئی کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان آیا آیا نہیں تھا، مگر طوفانی آثار ہر طرف اُمنڈنے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی، یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اِجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دِیا جائے گا۔ یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دیے ہیں اَور وہ اُن سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اِس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زُلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اَور اُس نے وقت کی صُورتِ حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر، جو مَیں نے دو سفروں کے درمیان بسر کیے، مَیں اِس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقعہ بہت کم مِلا۔ وہ میری طبیعت کی اُفتاد سے واقِف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اِس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے، اَور مَیں پسند نہیں کرتا کہ اِس خاموشی میں خلل پڑے۔ اِس لیے وہ بھی خاموش تھی، لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دُوسرے کی باتیں سُن رہے تھے، اَور اُن کا مطلب اچھی طرح سمجھ

ؔ گرفتاری کے بعد جو بیانات اخباروں میں آئے، اُن سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ افواہیں بے اصل نہ تھیں۔ سکریٹری آف اسٹیٹ اَور وائسرائے کی یہی رائے تھی کہ ہمیں گرفتار کر کے مشرقی افریقہ بھیج دیا جائے اَور اِس غرض سے بعض اِنتظامات بھی کر لیے گئے تھے، لیکن پھر رائے بدل گئی، اور بالآخر طے پایا کہ قلعۂ احمد نگر میں فوجی نگرانی کے تحت رکھا جائے، اَور ایسی سختیاں عمل میں لائی جائیں کہ ہندوستان سے باہر بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ یہیں حاصل ہو جائے۔

رہے تھے۔ ۳ر اگست کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا، تو وہ حسبِ معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آ گیا تو ۱۳ر اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اُس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا، لیکن وہ کہنا بھی چاہتی، تو اِس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اُس کے چہرے کا خاموش اِضطراب کہہ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشک بار تھا:

خود را بہ حیلہ پیشِ تو خاموش کردہ ایم

گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے، اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں، لیکن میں نے اِس درجہ افسردہ خاطر اُسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی، جو اُس کی طبیعت پر غالب آ گئی تھی؟ میں نے اُس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا، لیکن اب سوچتا ہوں، تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اُسے صورتِ حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اِس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اِس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا، وہ اِس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

وہ میری طبیعت کی اُفتاد سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اِس طرح کے موقعوں پر اگر اُس کی طرف سے ذرا بھی اِضطرابِ طبع کا اِظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا، اور عرصہ تک اُس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ ۱۹۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی، تو وہ اپنا اِضطرابِ خاطر روک نہیں سکی تھی، اور میں عرصہ تک اُس سے ناخوش رہا تھا۔ اِس واقعہ نے ہمیشہ کے لیے اُس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا، اور اُس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اُس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا، بلکہ پوری ہمت اور اِستقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوش گوار حالات برداشت کیے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔ پھر کیا بات تھی کہ اِس موقعہ پر وہ اپنی طبیعت کے اِضطراب پر غالب نہ آ سکی؟ غالباً یہی بات تھی کہ اُس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیں پڑنا شروع ہو گئی تھی۔

گرفتاری کے بعد کچھ عرصہ تک ہمیں عزیزوں سے خط و کتابت کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ پھر جب یہ روک ہٹالی گئی تو، ۱ر ستمبر کو مجھے اُس کا پہلا خط ملا، اور اُس کے بعد برابر خطوط ملتے رہے چوں کہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیماری کا حال لکھ کر مجھے پریشان خاطر کرنا پسند نہیں کرے گی، اِس لیے گھر کے بعض دوسرے عزیزوں سے حالت دریافت کرتا رہتا تھا۔ خطوط یہاں عموماً تاریخِ کتابت سے دس بارہ دِن بعد ملتے ہیں، اِس لیے کوئی بات جلد معلوم ہو نہیں سکتی۔ ۱۵ر فروری کو مجھے ایک خط ۲ر فروری کا بھیجا ہوا ملا، جس میں لکھا تھا کہ اُس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں نے تار کے ذریعہ مزید صورتِ حال دریافت کی، تو ایک ہفتہ کے بعد جواب ملا کہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔

۲۲ر مارچ کو مجھے پہلی اِطلاع اُس کی خطرناک علالت کی ملی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلی گرام کے ذریعہ سپرنٹنڈنٹ کو اِطلاع دی کہ اِس مضمون کا ایک ٹیلی گرام اُسے کلکتہ سے ملا ہے۔ نہیں معلوم جو ٹیلی گرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا، وہ کس تاریخ کا تھا، اور کتنے دِنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچا دینی چاہیے۔

چوں کہ حکومت نے ہماری قید کا محل اپنی دانست میں پوشیدہ رکھا ہے، اِس لیے ابتدا سے یہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا کہ نہ تو یہاں سے کوئی ٹیلی گرام باہر بھیجا جا سکتا ہے، نہ باہر سے کوئی آسکتا ہے۔ کیوں کہ اگر آئے گا تو ٹیلی گراف آفس ہی کے ذریعے آئے گا، اور اُس صورت میں آفس کے لوگوں پر راز کھل جائے گا۔ اِس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بات کتنی ہی جلدی کی ہو، لیکن تار کے ذریعہ نہیں بھیجی جا سکتی۔ اگر تار بھیجنا ہو تو اُسے لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو دے دینا چاہیے۔ وہ اُسے خط کے ذریعہ بمبئی بھیجے گا، وہاں سے اِحتساب کے بعد اُسے آگے روانہ کیا جا سکتا ہے۔ خط و کتابت کی نگرانی کے لحاظ سے یہاں قیدیوں کی دو قسمیں کر دی گئی ہیں۔ بعض کے لیے صرف بمبئی کی نگرانی کافی سمجھی گئی ہے۔ بعض کے لیے ضروری ہے کہ اُن کی تمام ڈاک دہلی جائے اور جب تک وہاں سے منظوری نہ مل جائے، آگے نہ بڑھائی جائے۔ چوں کہ میری ڈاک دوسری قسم میں داخل ہے اِس لیے مجھے کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے نہیں مل سکتا، اور نہ میرا

کوئی تار ایک ہفتہ سے پہلے کلکتہ پہنچ سکتا ہے۔

یہ تار جو ۲۳ مارچ کو یہاں پہنچا، فوجی رمز (CODE) میں لکھا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ اُسے حل نہیں کر سکتا تھا، وہ اُسے فوجی ہیڈ کوارٹر میں لے گیا۔ وہاں اتفاقاً کوئی آدمی موجود نہ تھا۔ اِس لیے پورا دِن اُسے حل کرنے کی کوشش میں نکل گیا۔ رات کو اس کی حل شدہ کاپی مجھے مِل سکی۔

دوسرے دِن اخبارات آئے، تو اُن میں بھی یہ معاملہ آچکا تھا۔ معلوم ہُوا، ڈاکٹروں نے صورتِ حال کی حکومت کو اطلاع دے دی ہے اور جواب کے مُنتظر ہیں۔ پھر بیماری کے متعلق معالجوں کی روزانہ اِطلاعات نکلنے لگیں۔ سُپرنٹنڈنٹ روز ریڈیو میں سُنتا تھا، اور یہاں بعض رفقا سے اُس کا ذِکر کر دیتا تھا۔

جس دِن تار ملا، اُس کے دوسرے دِن سُپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر مَیں اِس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، تو وہ اُسے فوراً بمبئی بھیج دے گا، اور یہاں کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اُس میں کوئی رُکاوٹ نہیں پڑے گی۔ وہ صورتِ حال سے بہت مُتاثر تھا، اور اپنی ہمدردی کا یقین دِلانا چاہتا تھا، لیکن مَیں نے اُس سے صاف صاف کہہ دیا کہ مَیں حکومت سے کوئی درخواست نہیں کرنا چاہتا۔ پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور اُن سے اِس بارے میں گفتگو کی۔ وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اِس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ مَیں نے اُن سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہُوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومتِ بمبئی کے ایما سے کہی تھی۔

جوں ہی خطرناک صورتِ حال کی خبر ملی، مَیں نے اپنے دِل کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ اِنسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ ساری عُمر ہم اُس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں، پھر بھی یہ مُعمّہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی اِبتدا سے ایسے حالات میں گزری کہ طبیعت کو ضبط و اِنقیاد میں لانے کے متواتر موقعے پیش آتے رہے، اور جہاں تک مُمکن تھا، اُن سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی:

تا دست رسم بود، ز دم چاک گریباں شرمندگی از خرقۂ پشمینہ نہ دارم

تاہم مَیں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہِل گیا ہے، اور اُسے قابو میں رکھنے کے لیے جد و جہد کرنی پڑے گی۔ یہ جد و جہد دماغ کو نہیں، مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔ اِس زمانے میں میرے دل و دِماغ کا جو حال رہا، مَیں اُسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اِس صورتِ حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کر لوں، اِس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا، لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔ مَیں نے محسوس کیا کہ اب دِماغ بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے، جو احساسات اور اِنفعالات کے ہر گوشہ میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے۔

سب سے پہلی کوشش یہ کرنی پڑی کہ یہاں زِندگی کی جو روزانہ معمولات ٹھہرائی جا چکی ہیں، اُن میں فرق نہ آنے پائے۔ چائے اور کھانے کے چار وقت ہیں جن میں مجھے اپنے کمرے سے نکلنا اور کمروں کی قطار کے آخری کمرہ میں جانا پڑتا ہے۔ چوں کہ زِندگی کی معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حِساب سے عادی ہو گیا ہوں، اِس لیے یہاں بھی اَوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی، اور تمام ساتھیوں کو اِس کا ساتھ دینا پڑا۔ مَیں نے اِن دنوں میں بھی اپنا معمول بہ دستور رکھا۔ ٹھیک وقت پر کمرہ سے نکلتا رہا، اور کھانے کی میز پر بیٹھتا رہا۔ بھوک یک قلم بند ہو چکی ہے، لیکن مَیں چند لقمے حلق سے اُتارتا رہا۔ رات کو کھانے کے بعد کچھ دیر تک صحن میں چند ساتھیوں کے ساتھ نشست رہا کرتی تھی، اُس میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ جتنی دیر تک وہاں بیٹھتا تھا، جس طرح باتیں کرتا تھا، اور جس قسم کی باتیں کرتا تھا، وہ سب کچھ بہ دستور ہوتا رہا۔ اخبارات یہاں بارہ سے ایک بجے کے اندر آیا کرتے ہیں۔ میرے کمرے کے سامنے دوسری طرف سپرنٹنڈنٹ کا دفتر ہے۔ جیلر وہاں سے اخبار لے کر سیدھا میرے کمرہ میں آتا ہے۔ جوں ہی اُس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ آنا شروع ہوتی تھی، دِل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملے گی۔ لیکن پھر مَیں فوراً چونک اُٹھتا۔ میرے صوفے کی پیٹھ دروازے کی طرف ہے، اِس لیے جب تک ایک آدمی اندر آ کے سامنے کھڑا نہ ہو جائے، میرا چہرہ دیکھ نہیں سکتا۔ جب جیلر آتا تھا، تو مَیں حسبِ معمول مُسکراتے ہوئے اِشارہ کرتا کہ اخبار ٹیبل

پر رکھ دے، اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا، گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہر داریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں، جسے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا، اور اس لیے کھیلتا تھا کہ کہیں اُس کے دامنِ صبر و وقار پر بے حالی اور پریشاں خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔

بدہ یارب دلے، کیں صورتِ بے جاں نمی خواہم

بالآخر ۹ اپریل کو زہرِ غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔

فَاِنَّ مَا تَحْذَرِیْنَ قَدْ وَقَعَ

۲ بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک تار حوالہ کیا، جس میں حادثہ کی خبر دی گئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعہ صبح ہی معلوم ہو گئی تھی، اور اُس نے یہاں بعض رفقا سے اُس کا ذکر بھی کر دیا تھا، لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔

اِس تمام عرصہ میں یہاں کے رفقا کا جو طرزِ عمل رہا، اُس کے لیے میں اُن کا شکر گزار ہوں۔ ابتدا میں جب علالت کی خبریں آنا شروع ہوئیں، تو قدرتی طور پر انھیں پریشانی ہوئی۔ وہ چاہتے تھے کہ اِس بارے میں جو کچھ کر سکتے ہیں کریں، لیکن جوں ہی انھیں معلوم ہو گیا کہ میں نے اپنے طرزِ عمل کا ایک فیصلہ کر لیا ہے اور میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا پسند نہیں کرتا، تو پھر سب نے خاموشی اختیار کر لی، اور اِس طرح میرے طریقِ کار میں کسی طرح کی مداخلت نہیں ہوئی۔

اِس طرح ہماری چھتیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں، مگر اُسی دیوار کی اوٹ سے۔

مجھے اِن چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا، مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پانو شل ہو گئے ہیں:

غافلِ نیم زراہ، ولے آہ چارہ نیست

زیں رہزناں کہ بر دلِ آگاہ می زنند

یہاں احاطہ کے اندر ایک پرانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے۔ جب سے آیا ہوں، سیکڑوں مرتبہ

اس پر نظر پڑ چکی ہے، لیکن اب اُسے دیکھتا ہوں، تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے، جیسے ایک نئے طرح کا اُنس اُس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہو۔ کل شام کو دیر تک اُسے دیکھتا رہا، اور متمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اُس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا، بے اختیار یاد آ گیا:

لَقَالَامنی عِنْدَ القُبُورِ عَلیٰ البکا — رفیقی لتذراف الدموع السّوافکٗ

فقال ابتلی کل قَبرٍ رَأیتَہٗ — لقبر ثویٰ بَین اللویٰ فا الدکارکٗ

فَقُلتُ لَہٗ اِنّ الشّجا یبعث الشجا — فدعنی، فھٰذا کلہٗ قبر مالکٗ

اب قلم روکتا ہوں۔ اگر آپ سنتے ہوتے تو بول اُٹھتے:

سودا! خُدا کے واسطے کر قصّہ مُختصر
اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے میں

قلعۂ احمد نگر

۱۶ ستمبر ۱۹۴۳ء

صدیقِ مکرّم !

بچّے ربڑ کے رنگین غبّاروں سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ مجھے بھی بچپنے میں اُن کا بڑا شوق تھا۔ والدِ مرحوم کے مُریدوں میں ایک شخص غلام رحمٰن تھا، جو انگریزی ٹوپیوں کے بنانے کا کاروبار کرتا تھا۔ وہ مجھے یہ غبّارے لادیا کرتا، اور میں اُس سے بہت ہِل گیا تھا۔ یہ غبّارے ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے منھ سے پھونکنے کے ہوتے ہیں، لیکن اِن میں گیس بھر دی جاتی ہے، اور وہ اِنھیں اوپر کی طرف اُڑائے رکھتی ہے۔ ایک مرتبہ مجھے خیال ہُوا، اِسے چیر کے دیکھنا چاہیے، اندر سے کیا نکلتا ہے! سہسرام کی ایک مُغلانی امانی نام، ہمارے گھر میں سِلائی کا کام کیا کرتی تھی۔ میں نے امانی کے سِلائی بکس سے ایک سوئی نکالی اور غبارے میں چبھو دی۔ اِس واقعہ پر سینتالیس برس گزر چکے ہیں، لیکن اِس وقت بھی خیال کرتا ہوں، تو اُس سنسنی کا اثر صاف صاف دِماغ میں محسوس ہونے لگتا ہے، جو اُس وقت اچانک گیس کے نکلنے اور ایک لمبی سی سی کی سی آواز پیدا ہونے سے مجھ پر طاری ہو گئی تھی۔ گیس باہر نکلنے کے لیے کچھ ایسی بے تاب تھی کہ سوئی کا ذرا سا چھید پاتے ہی فوراً فوّارہ کی طرح مُضطربانہ اُچھلی، اور دو تین سکنڈ بھی ابھی نہیں گزرے تھے کہ غبّارہ خالی ہو کے سکڑ گیا اور زمین پر گر گیا۔

یقین کیجیے، آج کل بعینہٖ ایسا ہی حال اپنے سینہ کا بھی محسوس کر رہا ہوں۔ غبّارے کی طرح اِس میں بھی کوئی پُرجوش عُنصر ہے، جو بھر گیا ہے اور نکلنے کے لیے بے تاب ہے۔ اگر کوئی ہاتھ ایک سوئی اُٹھا کر چبھو دے، تو مجھے یقین ہے، اِس میں سے بھی ویسا ہی جوش اُمنڈ کر اُچھلے گا، جیسا غبّارہ سے ایک مُضطرب چیخ کے ساتھ اُچھلا تھا:

شُد آں کہ اہلِ نظر بر کنارہ می رفتند
ہزار گونہ سُخن بر دہان و لب خاموش

بہ بانگِ چنگ بگوئیم آں حکایتہا
کہ از نہفتنِ آں دیگِ سینہ می زد جوش

کل رات ایک عجیب طرح کی حالت پیش آئی۔ کچھ دیر کے لیے ایسا محسوس ہونے لگا کہ سوئی چبھ رہی ہے اور شاید دل کی بھاپ پانی بن کر بہنا شروع ہو جائے۔ لیکن یہ محض ایک سانحہ تھا، جو آیا اور گزر گیا اور طبیعت پھر بند کی بند رہ گئی۔ دیگ نے جوش کھایا لیکن پھوٹ کر بہ نہ سکی۔

ضُعف سے گریہ مُبدّل بہ دمِ سرد ہُوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

میرے ساتھ لاسلکی کا ایک سفری (پورٹیبل) سٹ سفر میں رہا کرتا تھا، جب بمبئی میں گرفتار کر کے یہاں لایا گیا، تو سامان کے ساتھ وہ بھی آ گیا۔ لیکن جب سامان قلعہ کے اندر لایا گیا، تو اُس میں سٹ نہیں تھا۔ معلوم ہُوا کہ باہر روک لیا گیا ہے۔ جیلر سے پوچھا تو اُس نے کہا؛ کمانڈنگ آفیسر کے حکم سے روکا گیا ہے، اور اب گورنمنٹ سے اِس بارے میں دریافت کیا جائے گا۔ بہر حال جب یہاں اخباروں کا آنا روک دیا گیا تھا، تو ظاہر ہے کہ لاسلکی کے سٹ کی اجازت کیوں کر دی جا سکتی تھی؟ تین ہفتہ کے بعد اخبار کی روک تو اٹھ گئی، مگر سٹ پھر بھی نہیں دیا گیا۔ وہ چیتہ خاں کے آفس میں مُقفّل پڑا رہا۔ اب میں نے چیتہ خاں کو دے دیا ہے کہ اپنے بنگلہ میں لگا کر کام میں لائے۔ کیوں کہ اب وہ جس بنگلہ میں مُنتقل ہُوا ہے، اُس میں لاسلکی سٹ نہیں ہے۔ لیکن آج کل کوئی فوجی افسر ہمارے احاطہ کے قریب قلعہ میں فروکش ہے، اُس کے پاس لاسلکی کا سٹ ہے۔ کبھی کبھی اُس کی آواز یہاں بھی آ نکلتی ہے۔ کل رات بہت صاف آنے لگی تھی۔ غالباً بی بی سی کا پروگرام تھا اور کوئی وایولین (VIOLIN) بجانے والا اپنا کمال دکھا رہا تھا۔ لے ایسی تھی جیسے کہ (MENDELSSOHN) کے مشہور قطعہ "نغمہ بغیر لفظ" (سونگس وِدآؤٹ ورڈز) کی سننے میں آئی تھی:

حدیثِ عشق کہ از حرف و صوت مستغنی ست بنالۂ دف و نے در خروش و ولولہ بود

ناگہاں ایک مُغنّیہ خوش لہجہ کی صدائے درد انگیز اُٹھی اور اس نے ساز کے زیر و بم کے ساتھ مل کر وہ عالم پیدا کر دیا، جس کی طرف خواجہ شیراز نے اشارہ کیا ہے۔

چہ راہ می زند ایں مُطربِ مقام شناس
کہ درمیانِ غزل قولِ آشنا آورد

پہلے طبیعت پر ایک فوری اثر پڑا، ایسا محسوس ہُوا، جیسے پھوڑا پھوٹنے لگا ہے، لیکن یہ حالت چند لمحوں سے زیادہ نہیں رہی۔ پھر دیکھا، تو بہ دستور انقباضِ خاطر واپس آگیا تھا:

یا مگر کاوشِ آں نشترِ مژگاں کم شُد
یا کہ خود زخمِ مرا لذّتِ آزار نماند

شاید آپ کو معلوم نہیں، ایک زمانہ میں مجھے فنِ موسیقی کے مُطالعہ اور مشق کا بھی شوق رہ چکا ہے۔ اس کا اشتغال کئی سال تک جاری رہا تھا۔ ابتدا اس کی یوں ہوئی کہ ۱۹۰۵ء میں جب تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا، اور طلبہ کو پڑھانے میں مشغول تھا، تو کتابوں کا شوق مجھے اکثر ایک کُتب فروش خدا بخش کے یہاں لے جایا کرتا تھا، جس نے ویلزلی اسٹریٹ میں مدرسہ کالج کے سامنے دُکان لے رکھی تھی، اور زیادہ تر عربی اور فارسی کی قلمی کتابوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ ایک دن اُس نے فقیر اللہ سیف خاں کی راگ درپن کا ایک نہایت خوش خط اور مصوّر نسخہ مجھے دکھایا اور کہا کہ یہ کتاب فنِ موسیقی میں ہے۔ سیف خاں عالمگیری عہد کا ایک امیر تھا اور ہندوستان کی موسیقی کے علم و عمل کا ماہر تھا۔ اُس نے سنسکرت کی ایک کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا، جو راگ درپن کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ نسخہ جو خدا بخش کے ہاتھ لگا تھا، آصف جاہ کے لڑکے ناصر جنگ شہید کے کُتب خانہ کا تھا۔ اور نہایت اہتمام کے ساتھ مرتّب کیا گیا تھا۔ میں ابھی اُس کا دیباچہ دیکھ رہا تھا کہ مسٹر ڈینسن راس آگئے جو اُس زمانے میں مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل تھے، اور ایرانی لہجہ میں فارسی بولنے کے بہت شائق تھے۔ یہ دیکھ کر کہ ایک کم سن لڑکا فارسی کی ایک قلمی کتاب کا غور و خوض سے مُطالعہ کر رہا ہے۔ متعجب ہوئے اور مجھ سے فارسی میں پوچھا، "یہ کس مُصنّف کی کتاب ہے؟" میں نے فارسی میں جواب دیا کہ

سیف خاں کی کتاب ہے اور فنِ موسیقی میں ہے۔ اُنھوں نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی اور خود پڑھنے کی کوشش کی۔ پھر کہا کہ ہندوستان کا فنِ موسیقی بہت مُشکل فن ہے۔ کیا تم اِس کتاب کے مطالب سمجھ سکتے ہو؟ میں نے کہا "جو کتاب بھی لکھی جاتی ہے، اِسی لیے لکھی جاتی ہے کہ لوگ پڑھیں اور سمجھیں۔ میں بھی اِسے پڑھوں گا تو سمجھ لوں گا"۔ اُنھوں نے ہنس کر کہا، "تم اِسے نہیں سمجھ سکتے۔ اگر سمجھ سکتے ہو، تو مجھے اِس صفحہ کا مطلب سمجھاؤ"۔ اُنھوں نے جس صفحہ کی طرف اِشارہ کیا تھا، اُس میں مبادیات کی بعض تقسیموں کا بیان تھا۔ میں نے الفاظ پڑھ لیے، مگر مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ شرمندہ ہو کر خاموش ہو گیا۔ اور بالآخر کہنا پڑا کہ اِس وقت اِس کا مطلب بیان نہیں کر سکتا۔ بہ غور مُطالعہ کرنے کے بعد بیان کر سکوں گا۔

میں نے کتاب لی اور گھر آ کر اُسے اوّل سے آخر تک پڑھ لیا۔ لیکن معلوم ہُوا کہ جب تک موسیقی کی مُصطلحات پر عبور نہ ہو، اور کسی ماہرِ فن سے اُس کی مبادیات سمجھ نہ لی جائیں، کتاب کا مطلب سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ طبیعت طالب علمی کے زمانے میں اِس بات کی خوگر ہو گئی تھی کہ جو کتاب بھی ہاتھ آئی، اُس پر ایک نظر ڈالی اور تمام مطالب پر عبور ہو گیا۔ اب جو یہ رکاوٹ پیش آئی، تو طبیعت کو سخت اُلجھن ہوئی۔ اور خیال ہُوا کہ کسی واقف کار سے مدد لینی چاہیے لیکن مدد لی جائے تو کس سے لی جائے؟ خاندانی زندگی کے حالات ایسے تھے کہ اِس کوچہ سے رسم و راہ رکھنے والوں کے ساتھ ملنا آسان نہ تھا۔ آخر خیال میتا خاں کی طرف گیا۔ اِس پیشہ کا یہی ایک آدمی تھا، جس کی ہمارے یہاں گزر تھی۔

اِس میتا خاں کا حال بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ سونی پت ضلع انبالہ کا رہنے والا تھا۔ اور پیشہ کا خاندانی گویّا تھا۔ گانے کے فن میں اچھی اِستعداد بہم پہنچائی تھی، اور دہلی اور جے پور کے اُستادوں سے تحصیل کی تھی۔ کلکتہ میں طوائفوں کی معلّمی کیا کرتا تھا:

تقریب کچھ تو بہرِ مُلاقات چاہیے

یہ والدِ مرحوم کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہُوا۔ اُن کا قاعدہ تھا کہ اِس طرح کے لوگوں کو مُرید نہیں کرتے تھے، لیکن اِصلاح و توبہ کا دروازہ بند بھی نہیں کرتے تھے۔ فرماتے: "بغیر بیعت

کے آتے رہو۔ دیکھو خدا کو کیا منظور ہے" اکثر حالتوں میں ایسا ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد لوگ خود بہ خود اپنا پیشہ چھوڑ کر تائب ہو گئے۔ چنانچہ مسیتا خاں کو بھی یہی جواب ملا۔ والد مرحوم جمعہ کے دن وعظ کے بعد جامع مسجد سے مکان آتے، تو کچھ دیر پہلے دیوان خانہ میں بیٹھتے، پھر اندر جاتے۔ خاص خاص مُرید پالکی کے ساتھ چلتے ہوئے اندر آجاتے، اور اپنی اپنی معروضات پیش کر کے رُخصت ہو جاتے۔ مسیتا خاں بھی ہر جُمعہ کے بعد حاضر ہوتا، اور دُور فرش کے کنارے دست بستہ کھڑا رہتا۔ کبھی والدِ مرحوم کی نظر پڑ جاتی، تو پوچھ لیتے۔ "مسیتا خاں! کیا حال ہے؟" عرض کرتا "حضور کی نظرِ کرم کا اُمیدوار ہوں۔" فرماتے "ہاں اپنے دِل کی لگن میں لگے رہو۔" وہ بے اختیار ہو کر قدموں پہ گر جاتا اور اپنے آنسوؤں کی جھڑی سے اُنھیں تر کر دیتا۔ ذوق نے کیا خوب کہا ہے:

ہوئے ہیں تر گریۂ ندامت سے اِس قدر آستین و دامن
کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے

کبھی عرض کرتا "رات کے دربار میں حاضری کا حُکم ہو جائے۔" یعنی رات کی مجلسِ خاص میں جو مُریدوں کی تعلیم و اِرشاد کے لیے ہفتہ میں ایک بار منعقد ہُوا کرتی تھی۔ اُسے والد مرحوم ٹال جاتے مگر اُن کے ٹالنے کا بھی ایک خاص طریقہ تھا۔ فرماتے "اچھی بات ہے۔ دیکھو! ساری باتیں اپنے وقت پر ہو رہیں گی۔ وہ جاں باختۂ اُمید و بیم اتنے ہی میں نہال ہو جاتا، اور رُومال سے آنسو پوچھتے ہوئے اپنے گھر کی راہ لیتا۔ خواجہ حافظ اِن معاملات کو کیا ڈوب کر کہہ گئے ہیں:

بہ حاجبِ درِ خلوت سرائے خاص بگو
فلاں ز گوشہ نشینانِ خاکِ درگہِ ماست

لیکن بالآخر اُس کا عجز و نیاز اور صدقِ طلب رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ والدِ مرحوم نے اُسے مُرید کر لیا تھا اور حلقہ میں بیٹھنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ اُسے بھی کچھ ایسی توفیق ملی کہ طوائفوں کی نوچیوں کی مُعلّمی سے تائب ہو گیا اور ایک بنگالی زمین دار کی مُلازمت پر قناعت کر لی۔ والدِ مرحوم کو مَیں نے ایک مرتبہ کہتے سُنا تھا کہ مسیتا خاں کا حال دیکھتا ہوں تو پیر چنگی کی حکایت

یاد آجاتی ہے۔ یعنی مولانا روم والے پیر چنگی کی :

پیرِ چنگی کے بود مرد خدا

حبّذا اے سرِّ پنہاں حبّذا !

بہرحال میرا خیال اِسی مسیتا خاں کی طرف گیا، اور اُس سے اِس مُعاملہ کا ذِکر کیا۔ پہلے تو اُسے کچھ حیرانی سی ہوئی، لیکن جب مُعاملہ پوری طرف سمجھ میں آگیا، تو بہت خوش ہوا کہ مُرشد زادہ کی نظرِ توجّہ اُس کی طرف مبذول ہوئی ہے۔ لیکن اب مُشکل یہ پیش آئی کہ یہ تجویز عمل میں لائی جائے تو کیسے لائی جائے؟ گھر میں جہاں ہدایہ اور مشکوٰۃ کے پڑھنے والوں کا مجمع رہتا تھا، سا، را، گا، ما کی سبق آموزیوں کا موقع نہ تھا، اور دوسری جگہ بالالتزام جانا اشکال سے خالی نہ تھا۔ بہرحال اِس مُشکل کا ایک حل نِکال لیا گیا اور ایک راز دار مِل گیا، جِس کے مکان میں نشست و برخاست کا اِنتظام ہو گیا۔ پہلے ہفتہ میں تین دِن مُقرّر کیے تھے، پھر روز سہ پہر کے وقت جانے لگا مسیتا خاں پہلے سے وہاں موجود رہتا، اور دو تین گھنٹے تک موسیقی کے علم و عمل کا مشغلہ جاری رہتا۔

عِشق می ورزم و اُمّید کہ ایں فنِّ شریف

چوں ہُنرہائے دِگر موجبِ حرماں نشود

مسیتا خاں نے تعلیم کا ایک ہی ڈھنگ رٹا ہُوا تھا۔ جو اِس فن کے اُستادوں کا عام طریقہ ہوتا ہے۔ وہی اُس نے یہاں بھی چلایا۔ لیکن مَیں نے اُسے روک دِیا، اور کوشش کی کہ اپنے طریقے پر معلومات مُرتّب کروں۔ موسیقی کے آلات میں زیادہ تر توجّہ سِتار پر ہوئی اور بہت جلد اُنگلیاں اُس سے آشنا ہو گئیں۔ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ بھی کیا زمانہ تھا، اور طبیعت کے کیا کیا ولولے تھے؟ میری عُمر سترہ برس سے زیادہ نہ ہوگی، لیکن اُس وقت بھی طبیعت کی اُفتاد یہی تھی کہ جِس مَیدان میں قدم اُٹھائیے، پوری طرح اُٹھائیے، اور جہاں تک راہ ملے بڑھتے ہی جائیے۔ کوئی کام بھی ہو، لیکن طبیعت اِس پر کبھی راضی نہیں ہوتی کہ ادھورا کر کے چھوڑ دیا جائے۔ جِس کوچہ میں بھی قدم اُٹھایا، اُسے پوری طرح چھان کر چھوڑا۔ ثواب کے

کام کیے، تو وہ بھی پوری طرح کیے۔ گناہ کے کام کیے تو انھیں بھی ادھورا نہ چھوڑا۔ رندی کا کوچہ ملا تھا، تو اس میں بھی سب سے آگے رہے تھے، پارسائی کی راہ ملی، تو اس میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ طبیعت کا تقاضہ ہمیشہ یہی رہا کہ جہاں کہیں جائیے، ناقصوں اور خام کاروں کی طرح نہ جائیے۔ رسم و راہ رکھیے تو راہ کے کاملوں سے رکھیے۔ شیخ علی حزیں نے میری زبانی کہا تھا:

تا دسترسم بود، ز دم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ نہ دارم

چنانچہ اس کوچہ میں بھی قدم رکھا، تو جہاں تک راہ مل سکی، قدم بڑھائے جانے میں کوتاہی نہیں کی۔ ستار کی مشق چار پانچ سال تک جاری رہی تھی۔ بین سے بھی انگلیاں ناآشنا نہیں رہیں۔ لیکن زیادہ دل بستگی اس سے نہ ہو سکی۔ پھر اس کے بعد ایک وقت آیا کہ یہ مشغلہ یک قلم متروک ہو گیا۔ اور اب تو گزرے ہوئے وقتوں کی صرف ایک کہانی باقی رہ گئی ہے۔ البتہ انگلی پر سے مضراب کا نشان بہت دنوں تک نہیں مٹا تھا:

اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

اس عالم رنگ و بو میں ایک روش تو مکھی کی ہوئی کہ شہد پر بیٹھتی ہے تو اس طرح بیٹھتی ہے کہ پھر اٹھ نہیں سکتی۔

کہ پانو توڑ کے بیٹھے ہیں پائے بند ترے

اور ایک بھونرے کی ہوئی، کہ ہر پھول پر بیٹھے، بو باس لی، اور اڑ گئے:

ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش کام ہوئے اور چل نکلے

چناں چہ زندگی کے چمنستانِ ہزار رنگ کا ایک پھول یہ بھی تھا۔ کچھ دیر کے لیے رک کر بو باس لے لی اور آگے نکل گئے۔ مقصود اس اشتغال سے صرف یہ تھا کہ طبیعت اس کوچہ سے ناآشنا نہ رہے۔ کیوں کہ طبیعت کا توازن اور فکر کی لطافت بغیر موسیقی کی ممارست کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب ایک خاص حد تک یہ مقصد حاصل ہو گیا، تو مزید اشتغال نہ صرف غیر ضروری تھا،

بلکہ موانع کار کے حکم میں داخل ہو گیا تھا۔ البتہ موسیقی کا ذوق اور تاثر جو دل کے ایک ایک ریشے میں رچ گیا تھا، دل سے نکالا نہیں جا سکتا تھا، اور آج تک نہیں نکلا:

جاتی ہے کشمکش کوئی اندوہِ عشق کی؟
دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا

حسن آواز میں ہو یا چہرے میں، تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں، حسن ہے، اور حسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے۔ افسوس اس محروم ازلی پر، جس کے بے حس دل نے اس مطالبہ کا جواب دینا نہ سیکھا ہو:

سینۂ گرم نداری، مطلب صحبتِ عشق
آتشے نیست چو در مجمرہ ات، عود مخر

میں آپ سے ایک بات کہوں۔ میں نے بارہا اپنی فطرت کو ٹٹولا ہے۔ میں زندگی کی احتیاجوں میں سے ہر چیز کے بغیر خوش ہو سکتا ہوں، لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آوازِ خوش میرے لیے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مداوا اور جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے۔

روئے نکو معالجۂ عمر کوتہ است
ایں نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ اند

مجھے اگر آپ زندگی کی رہی سہی راحتوں سے محروم کر دینا چاہتے ہوں، تو صرف اس ایک چیز سے محروم کر دیجیے، آپ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ یہاں احمد نگر کے قید خانہ میں اگر کسی چیز کا فقدان مجھے ہر شام محسوس ہوتا ہے، تو وہ ریڈیو سٹ کا فقدان ہے۔

لذتِ معصیت عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

جس زمانے میں موسیقی کا اشتغال جاری تھا، طبیعت کی خود رفتگی اور محویت کے بعض ناقابل فراموش احوال پیش آئے۔ جو اگرچہ خود گزر گئے، لیکن ہمیشہ کے لیے دامنِ زندگی پر اپنا رنگ چھوڑ

گئے۔ اُسی زمانے کا واقعہ ہے کہ آگرہ کے سفر کا اِتّفاق ہُوا۔ اپریل کا مہینہ تھا، اور چاندنی ڈھلتی ہوئی راتیں تھی۔ جب رات کی پچھلی پہر شروع ہونے کو ہوتی، تو چاند پردۂ شب ہٹا کر یکایک جھانکنے لگتا۔ میں نے خاص طور پر کوشش کر کے ایسا اِنتظام کر رکھا تھا کہ رات کو ستار لے کر تاج چلا جاتا، اور اُس کی چھت پر جمنا کے رُخ بیٹھ جاتا۔ پھر جوں ہی چاندنی پھیلنے لگتی، ستار پر کوئی گیت چھیڑ دیتا اور اُس میں محو ہو جاتا۔ کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ فریبِ تخیّل کے کیسے کیسے جلوے اِنھیں آنکھوں کے سامنے گزر چکے ہیں۔

گدائے مے کدہ ام، لیک وقتِ مستی بیں
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

رات کا سنّاٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات، چاروں طرف تاج کے منارے سر اُٹھائے کھڑے تھے، بُرجیاں دم بہ خود بیٹھی تھیں۔ بیچ میں چاندنی سے دُھلا ہُوا گنبد اپنی کُرسی پر بے حِس و حرکت متمکّن تھا۔ نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دَوڑ رہی تھیں۔ اور اُوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں نور و ظُلمت کی اِس مِلی جُلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اُٹھتے اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے۔ آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری اُنگلی کے زخموں سے نغمے۔

زخمہ بر تارِ رگِ جاں می زنیم
کس چہ داند تا چہ دستاں می زنیم

کُچھ دیر تک فضا تھمی رہتی۔ گویا کان لگا کر خاموشی سے سُن رہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ہر تماشائی حرکت میں آنے لگتا۔ چاند بڑھنے لگتا، یہاں تک کہ سر پر آ کھڑا ہوتا۔ ستارے دیدے پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگتے۔ درختوں کی ٹہنیاں کیفیت میں آ آ کر جھومنے لگتیں۔ رات کے سیاہ پردوں کے اندر سے عناصر کی سرگوشیاں صاف صاف سنائی دیتیں۔ بارہا تاج کی بُرجیاں اپنی جگہ سے ہِل گئیں، اور کتنے ہی مرتبہ ایسا ہُوا کہ منارے اپنے کاندھوں کو جُنبش سے نہ روک سکے۔

آپ باور کریں یا نہ کریں، مگر یہ واقع ہے کہ اِس عالم میں بارہا میں نے بُرجیوں سے باتیں کی ہیں، اور جب کبھی تاج کے گُنبدِ خاموش کی طرف نظر اُٹھائی ہے، تو اُس کے لبوں کو ہلتا ہُوا پایا ہے:

تو پندار کہ ایں قصّہ زخود می گویم
گوش نزدیکِ لبم آر کہ آوازے ہست

اِس زمانے کے کُچھ عرصہ بعد لکھنؤ جانے اور کئی ماہ تک ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ آپ بھولے نہ ہوں گے کہ سب سے پہلے آپ سے وہیں مُلاقات ہوئی تھی۔ آپ نے قلمی کتابوں کے تاجر عبدالحسین سے کُلیاتِ صائب کا ایک نُسخہ خریدا تھا، اور مجھے یہ کہہ کر دِکھایا تھا کہ قلمی کتابوں کا بھی آپ کو کُچھ شوق ہے؟

ایں سُخن را چہ جواب ست تو ہم می دانی

اِسی قیام کے دَوران میں مِرزا محمّد ہادی مرحوم سے شناسائی ہوئی۔ وہ موسیقی میں کافی دخل رکھتے تھے، اور چوں کہ علم و فن کی راہوں سے آشنا تھے، اِس لیے علمی طریقہ پر اُسے سمجھتے اور سمجھا سکتے تھے۔ مجھے اُن سے اپنی معلومات کی تکمیل میں مدد ملی۔ افسوس! وہ بھی چل بسے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس! تُم کو میر سے صُحبت نہیں رہی

اُس زمانے میں کرسچین کالج کے سامنے پانچ رُوپیہ ماہوار کرایہ کا ایک مکان لے رکھا تھا۔ وہی اُن کی دُنیا تھی۔ علم ہیئت کے شوق نے نجّاری کے مشغلہ سے آشنا کر دیا تھا۔ جب کالج سے آتے تو مکان کی چھت پر لکڑی کے دوائر قُطر اور نِصف اور ثُلث بنانے میں مشغول ہو جاتے، اور اس طرح اپنی رصد بندیوں کا سامان کرتے۔ چھت کی سیڑھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ جست لگا کر اُوپر پہنچتے اور پھر ساری رات سِتاروں کی ہم نشینی میں بسر کر دیتے۔

کہ باجام و سبُو ہر شب قرینِ ماہ و پرویم

کئی برس کے بعد پھر لکھنؤ جانے کا اتفاق ہُوا، تو اُنھیں ایک دوسرے ہی عالم میں پایا۔ ایک

رشتہ دار کے انتقال سے کاپی کی کچھ جائداد ورثہ میں مل گئی تھی، اور اب جوانی کی محرومیوں کا بڑھاپے کی ذوق اندوزیوں سے کفارہ کرنا چاہتے تھے

وقتِ عزیز رفت، بیا تا قضا کنیم
عمرے کہ بے حضورِ صراحی و جام رفت

یہ گرم جوشیاں چوں کہ موسیقی کے ذوق کے پردے میں ابھری تھیں، اس لیے شاہدانِ نغمہ پرداز سے صحبتیں گرم رہتی تھیں، اور بعض استادانِ فن سے بھی مذاکرہ جاری رہتا۔ اس مرتبہ اگرچہ میرا قیام بہت مختصر رہا، لیکن جتنے دن رہا، موسیقی کے مذاکرات ہوتے رہے۔ اسی زمانے کے کچھ عرصہ بعد انھوں نے معارف النغمات کی ترتیب میں مدد دی، جو چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

بچپنے میں حجاز کی مترنم صداؤں سے کان آشنا ہو گئے تھے۔ صدرِ اول کے زمانے سے لے کر جس کا حال ہم کتاب الاغانی اور عقد الفرید وغیرہ میں پڑھ چکے ہیں، آج تک حجازیوں کا ذوقِ موسیقی غیر متغیر رہا۔ یہ ذوق ان کے خمیر میں کچھ اس طرح پیوست ہو گیا تھا کہ ان کی صداؤں تک کو موسیقی کے نقشوں میں ڈھال دیا۔ آج کل کا حال معلوم نہیں، لیکن اس زمانے میں حرم شریف کے ہر منارہ پر ایک موذن متعین ہوتا تھا، اور ان سب کے اوپر شیخ الموذنین ہوتا۔ اس زمانے میں شیخ الموذنین شیخ حسن تھے، اور بڑے ہی خوش آواز تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رات کی پچھلی پہر میں ان کی ترجیع کی نوائیں ایک سماں باندھ دیا کرتی تھیں۔ ہمارا مکان قدوہ میں باب السلام کے پاس تھا۔ کوٹھے کی کھڑکیوں سے مناروں کی قندیلیں صاف نظر آتی تھیں، اور صبح کی اذان تو اس طرح سنائی دیتی تھی جیسے چھت پر کوئی اذان دے رہا ہو۔ جب عراق اور مصر و شام کے سفر کا اتفاق ہوا، تو موجودہ عربی موسیقی کی جستجو ہوئی۔ معلوم ہوا کہ قدما کی بہت سی مصطلحات

صبح کی اذان سے پہلے مختلف کلماتِ ادعیہ ایک خاص لحن میں دہرائے جاتے ہیں، اسے "ترجیع" کہتے ہیں۔ کم سے کم چار سو برس پہلے بھی یہ رسم جاری تھی، کیوں کہ ملا علی قاری اور صاحب الباعث نے اسے بھی بدع و محدثات میں شمار کیا تھا۔

جو ہمیں کتاب الاغانی اور خوارزمی وغیرہ میں ملتی ہیں، اب کوئی نہیں جانتا۔ تعبیر و تقسیم کے اسمار، ورموز تقریباً بدل گئے ہیں، اور عربی کی جن مصطلحات نے ایران پہنچ کر فارسی کا جامہ پہن لیا تھا وہ اب پھر عربی میں واپس آکر معرب ہوگئی ہیں۔ البتہ فن کی پرانی بنیادیں ابھی تک متزلزل نہیں ہوئیں۔ وہی بارہ راگنیاں اب بھی اصل و بنیاد کا کام دے رہی ہیں، جو یونانی موسیقی کی تقلید میں وضع ہوئی تھیں۔ آسمان کے بارہ برجوں کی طرف اب بھی انھیں اسی طرح منسوب کیا جاتا ہے، جس طرح قدما نے کیا تھا۔ آلاتِ موسیقی میں اگرچہ بہت سی تبدیلیاں ہوگئیں، لیکن عود کے پردے ابھی تک خاموش نہیں ہوئے ہیں، اور ان کے زخموں سے وہ نوائیں اب بھی سنی جاسکتی ہیں، جو کبھی ہارون الرشید کی شبستانِ طرب میں اسحاق موصلی اور ابراہیم مہدی کے مضراب سے اٹھا کرتی تھیں۔

ایں مطرب از کجاست کہ سازِ "عراق" ساخت
واہنگ بازگشت زراہ "حجاز" کرد

"عراق" اور "حجاز" دو راگنیوں کے نام ہیں، اور "راہ" یعنی سُر

مطرب نگاہ دار ہمیں "رہ" کہ می زنی

اس زمانے میں شیخ احمد سلامہ حجازی کا جوق مصر میں بہت مشہور اور نام ور تھا۔ "جوق" وہاں منڈلی کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ ہم نے یہاں منڈلی کے لیے "طائفہ" کا لفظ اختیار کیا تھا۔ پھر اس کی جمع "طوائف" ہوئی، اور رفتہ رفتہ طوائف کے لفظ نے مفرد معنی پیدا کر لیے، یعنی زنِ رقاصہ و مغنیہ کے معنی میں بولا جانے لگا۔ شیخ سلامہ کا جوق قاہرہ کے اوپرا ہاؤس میں اکثر اپنا کمال دکھایا کرتا تھا۔ اور شہر کی کوئی بزم طرب بغیر اس کے بارونق نہیں سمجھی جاتی تھی۔ مجھے بارہا اس کے سننے کا اتفاق ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ عربی موسیقی آج کل جیسی کچھ اور جتنی کچھ بھی ہے، وہ اس کا پورا ماہر تھا۔ ایک دوست کے ذریعہ اس سے شناسائی پیدا کی تھی اور موجودہ عربی موسیقی پر مذاکرات کیے تھے۔

اس زمانے میں مصر کی ایک مشہور "عالمہ" طاہرہ نامی باشندۂ طنطا تھی۔ "عالمہ" مصر میں "مغنیہ" کو کہتے ہیں، یعنی موسیقی کا علم جاننے والی۔ ہمارے علمائے کرام کو اس اصطلاح سے غلط فہمی نہ ہو۔ یورپ

کی زبانوں میں یہی لفظ (ALMA) ہو گیا ہے۔ شیخ سلامہ بھی اُس عالمہ کی فن دانی کا اعتراف کرتا تھا۔ وہ خود بھی بلائے جان تھی، مگر اُس کی آواز اس سے بھی زیادہ آفتِ ہوش و ایمان تھی۔ میں نے اُس سے بھی شناسائی بہم پہنچائی اور عربی موسیقی کے کمالات سُنے۔ دیکھیے، اس خانماں خراب شوق نے کن کن گلیوں کی خاک چھنوائی:

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

جس زمانے کے یہ واقعات لکھ رہا ہوں، اُس سے کئی سال بعد مصر میں اُمِّ کلثوم کی شہرت ہوئی اور اب تک قائم ہے۔ میں نے اُس کے بے شمار ریکارڈ سُنے ہیں، اور قاہرہ، انگورہ، طرابلس الغرب، فلسطین اور سنگاپور کے ریڈیو اسٹیشن آج کل بھی اُس کی نواؤں سے گونجتے رہتے ہیں۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس شخص نے اُمِّ کلثوم کی آواز نہیں سُنی ہے، وہ موجودہ عربی موسیقی کی دل آویزیوں کا کچھ اندازہ نہیں کر سکتا۔ اُس کے مشہور انشادات میں سے ایک نشید علیہ بنت المہدی کا مشہور نسیب ہے:

وحبب، فان الحب داعیة الحب
وکم من بعید الدار مستوجب القرب

البتہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ قدیم یونانی موسیقی کی طرح عربی موسیقی بھی نسبتہً سادہ اور دقتِ تالیف کی کاوشوں سے خالی ہے۔ ہندوستان نے اِس معاملہ کو جن گہرائیوں تک پہنچا دیا، حق یہ ہے کہ قدیم تمدنوں میں سے کوئی تمدن بھی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ حُسنِ تقسیم اور دقتِ ترتیب یہاں کی ہر فنی شاخ کی عام خصوصیت رہی ہے۔ لیکن جہاں تک نفسِ فن کی دقیقہ سنجیوں کا تعلق ہے، اِس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ یورپ کا موجودہ فن موسیقی جس کی بُنیاد نشاۃ ثانیہ (RENASCENCE) کے باکمالوں نے رکھی تھی، منتہائے کمال تک پہنچا دیا گیا ہے، اور گو ذوقِ سماعت کے اختلاف سے ہمارے کان اُس کی پوری قدر شناسی نہ کر سکیں، لیکن دماغ اُس کی عظمت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دراصل اشیا و معانی کے تمام مرکب مزاجوں کی طرح موسیقی کا مزاج بھی ترکیبی واقع ہوا

ہے اور سارا معاملہ مُفرد اصوات و اِلحان کی تالیف سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ اِن مُفرد اجزا کی ترکیب کا تسویہ اور تناسُب جس قدر دقیق اور نازک ہوتا جائے گا، موسیقی کی گہرائیاں اُتنی ہی بڑھتی جائیں گی۔ اِس اِعتبار سے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا یورپ کا فنِ موسیقی فکرِ انسانی کی دِقّت آفرینیوں کا ایک غیر معمولی نمونہ ہے، اور جرمنی کے باکمالان فن نے تو اِس باب میں بڑی ہی سحر کاری کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موسیقی اور شاعری ایک ہی حقیقت کے دو مختلف جلوے ہیں، اور ٹھیک ایک ہی طریقہ پر ظہور پذیر بھی ہوتے ہیں۔ موسیقی کا مولّف اِلحان کے اجزا کو وزن و تناسب کے ساتھ ترکیب دے دیتا ہے، اُسی طرح شاعر بھی الفاظ و معانی کے اجزا کو حُسنِ ترکیب کے ساتھ باہم جوڑ دیتا ہے۔

تو حنا بستی و من معنیِ رنگیں بستم

جو حقائق شعر میں الفاظ و معانی کا جامہ پہن لیتے ہیں، وہی موسیقی میں الحان و ایقاع کا بھیس اختیار کر لیتے ہیں۔ نغمہ بھی ایک شعر ہے، لیکن اُسے حرف و لفظ کا بھیس نہیں مِلا، اُس نے اپنی رُوحِ معنی کے لیے نواؤں کا بھیس تیار کر لیا:

وَالاذن تعشق قبلَ العینِ احیانا

یہ کیا بات ہے کہ بعض الحان درد و الم کے جذبات برانگیختہ کر دیتے ہیں۔ بعض کے سُننے سے مسرّت و اِنبساط کے جذبات اُمنڈنے لگتے ہیں۔ بعض کی لَے ایسی ہوتی ہے جیسے کہہ رہی ہو کہ زندگی اور زندگی کے سارے ہنگامے ہیچ ہیں۔ بعض کی لَے ایسی محسوس ہوتی ہے جیسے اِشارہ کر رہی ہو کہ:

یاراں صلائے عام ست گرمی کنید کارے

یہ وہی معانی ہیں جو موسیقی کی زبان میں اُبھرنے لگتے ہیں۔ اگر یہ شعر کا جامہ پہن لیتے تو کبھی حافظ کا ترانہ ہوتا، کبھی خیام کا زمزمہ، کبھی شیلے (SHELLEY) کی ماتم سرائیاں ہوتیں، کبھی ورڈس ورتھ کی حقیقت سرائیاں:

دریں میدانِ پُر نیرنگ حیران ست دانائی
کہ یک ہنگامہ آرائی و صد کشور تماشائی

یہ عجیب بات ہے کہ عربوں نے ہندوستان کے تمام علوم و فنون میں دِل چسپی لی، لیکن ہندوستان کی موسیقی پر ایک غلط انداز نظر بھی نہ ڈال سکے۔ ابوریحان البیرونی نے کتاب الہند میں ہندوؤں کے تمام علوم و عقائد پر نظر ڈالی ہے، اور ایک باب 'فی کتبہم فی سائر العلوم' پر بھی لکھا ہے، مگر موسیقی کا اُس میں کوئی ذِکر نہیں۔ ڈاکٹر اڈورڈ سخاؤ (SACHAU) نے 'الآثار الباقیہ' کے مُقدمہ میں البیرونی کا ایک مکتوب درج کیا ہے، جس میں اُس نے اپنی تمام مصنّفات کا بہ تفصیل ذِکر کیا تھا۔ لیکن اُس میں بھی اِس موضوع پر کوئی تصنیف نظر نہیں آتی۔ حالاں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے نائک سلطان محمود اور سلطان مسعود کے درباروں میں اپنے کمالاتِ فن کی نمائشیں کرنے لگے تھے، اور ہندوستان کے ڈھول اور باجے غزنین کے گلی کوچوں میں بجائے جا رہے تھے۔ غالباً اِس تغافل کی وجہ کُچھ تو یہ ہوگی کہ علوم عقلیہ کے شوق و اشتغال نے اِس کی بہت کم مہلت دی کہ فنونِ لطیفہ کی طرف توجّہ کرتے، اور کچھ یہ بات بھی ہوگی کہ عربوں کا ذوقِ سماع ہندوستان کے ذوقِ سماع سے اِس درجہ مُختلف تھا کہ ایک کے کان دوسرے کی نواؤں سے بہ مُشکل آشنا ہو سکتے تھے۔

ہندوستان کی موسیقی کی طرح ہندوستان کے ڈراموں سے بھی عرب مُصنّف یک قلم ناآشنا رہے۔ البیرونی نے سنسکرت کی شاعری اور فن عروض کا بہ تفصیل ذِکر کیا ہے۔ لیکن ناٹک کا کوئی ذِکر نہیں کرتا، حالاں کہ یونانی ادبیات کی طرح سنسکرت ادبیات کی بھی ایک خاص اور ممتاز چیز ناٹک ہے۔

خود یونان کے فنونِ ادبیہ کے ساتھ بھی عربوں نے ایسا ہی تغافل برتا۔ یونان کی شاعری اور ڈراموں کی انھیں بہت کم خبر تھی۔ ہومر اور سوفاکلیس وغیرہما کے نام انھیں ارسطو کے مقالات اور افلاطون کی جمہوریت سے معلوم ہو گئے تھے، لیکن اِس سے زیادہ کُچھ معلوم نہ کر سکے۔ ابنِ رشد نے کامیڈی اور ٹریجڈی کی جو تعریف اپنی شرح میں کی ہے، اُس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ

یونانی ڈراما کی حقیقت سے اُس کا دماغ کس درجہ نا آشنا تھا۔ وہ کامیڈی کو ہجو اور ٹریجڈی کو مدح سے تعبیر کرتا ہے۔

یہ بات بھی صاف نہیں ہوئی کہ یونانی فنِ بلاغت سے ائمۂ بلاغتِ عرب کہاں تک متاثر ہوئے تھے۔ بہ ظاہر انھوں نے اسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ ارسطو کے مقالات کتابت اور شاعری پر عربی میں منتقل ہو گئے تھے، اور ابنِ رشد نے اپنی شروح میں انھیں بھی شامل کیا۔ لیکن عرب ائمۂ فن نہ تو اُس کی روح سمجھ سکے، اور نہ بلاغتِ عربی کی سرگرانیوں نے اس کی مہلت دی کہ سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ارسطو نے اپنے دونوں مقالوں میں جو کچھ لکھا ہے، وہ تمام تر یونانی خطابت اور شاعری کے نمونوں پر مبنی ہے، اور عربی دماغ اُن سے آشنا نہ تھا۔ آپ نے ابنِ قدامہ کی نقد الشعر کا ضرور مطالعہ کیا ہوگا۔ چوتھی صدی کے بغداد کے علمی حلقہ میں اُس کا نشو و نما ہوا تھا، اور وہ نسلاً رومی تھا۔ چند سال ہوئے اسکوریال (اسپین) کے کتب خانہ میں ایک کتاب کا سراغ ملا، جس کی لوح پر نقد الشعر درج تھا مگر مصنف کا نام مٹا ہوا تھا۔ بہت غور کرنے سے ابو جعفر ابنِ قدامہ سے ملتے جلتے حروف دکھائی دینے لگے۔ جب اس نام کی کتاب دنیا کے کتب خانوں کی فہرستوں میں ڈھونڈی گئی، تو معلوم ہوا کہ کوئی دوسرا نسخہ اس کا موجود نہیں۔ اسکوریال کے کتب خانہ میں زیادہ تر وہی کتابیں ہیں جو سترھویں صدی میں سلطانِ مراکش کے دو جہازوں کی لوٹ سے اسپین کے ہاتھ آئی تھیں۔ چوں کہ اُس زمانہ میں اسلامی ذخیروں کو تباہ کرنے کی مسیحی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ چکی تھیں، اس لیے انھیں ضائع نہیں کیا گیا، اور اسکوریال کی خانقاہ میں رکھ دی گئیں۔ یقیناً یہ نسخہ بھی اُسی لوٹ میں آگیا ہوگا۔ پچھلے دنوں جامعہ مصریہ کے ادارہ نے اُس کا عکس حاصل کیا اور ڈاکٹر منصور اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی ترتیب و تصحیح کے بعد چھپ کر شائع ہو گیا۔ دونوں نے اس پر الگ الگ مقدمے بھی لکھے ہیں۔ بہ ظاہر اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ یہ رسالہ بھی نقد الشعر کے مصنف ہی کے قلم سے نکلا ہے۔ رسالہ کے اسلوبِ بیان میں منطقی طریقِ بحث و تحلیل صاف نمایاں ہے، جو آگے چل کر فنِ بلاغت پر بالکل چھا گیا۔ لیکن اصولِ فن خالص عربی ہیں، اور امثال و نظائر میں بھی باہر کے اثرات کی کوئی پرچھائیں دکھائی نہیں دیتی۔ البتہ بلاغت کی حقیقت

پر بحث کرتے ہوئے یونان اور ہندوستان کے بعض اقوال جاحظ کے حوالہ سے نقل کر دیے ہیں اور وہ سب نے نقل کیے ہیں۔

لیکن عربوں نے جو تغافل یونانی ادبیات سے برتا تھا، وہ اس کے فن موسیقی سے برت نہیں سکتے تھے، کیوں کہ خود عربوں کا فن موسیقی کچھ نہ تھا۔ اور جتنی کچھ عمارت بھی انھوں نے اٹھائی تھی، اس کا تمام تر مواد ایران کی ساسانی موسیقی کے کھنڈروں سے حاصل کیا گیا تھا۔

نوائے بار بد ماندست و دستاں

چنانچہ کافی تصریحات موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یونان کے فن موسیقی پر عربی میں کتابیں لکھی گئیں، اور ریاضی کی ایک شاخ کی حیثیت سے اس کا عام طور پر مطالعہ کیا گیا۔ یونانیوں نے آسمان کے بارہ فرضی برجوں کی مناسبت سے راگنیوں کی بارہ بنیادی تقسیمیں کی تھیں، اور ہر راگنی کو کسی ایک برج کی طرف منسوب کر دیا تھا۔ عربوں نے بھی اسی بنیاد پر عمارت اٹھائی۔ یونان اور روم کے آلات میں قانون اور ارغنون (ارگن) عام طور پر رائج ہو گئے تھے۔ ابو نصر فارابی نے قانون پر ایک مستقل رسالہ بھی لکھا ہے۔ اخوان الصفا کے مصنفوں کو بھی موسیقی سے اعتنا کرنا پڑا۔

سندھ کے نو آباد عرب ہندوستان کی موسیقی سے، جو ان اطراف میں رائج ہوگی، ضرور آشنا ہوئے ہوں گے۔ لیکن تاریخ میں سندھ کے عربی عہد کے حالات اتنے کم ملتے ہیں کہ جزم کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، البتہ چھٹی صدی ہجری سے شمالی ہند اور دکن کے نئے اسلامی دوروں کا جو سلسلہ شروع ہوا، ان سے ہم مسلمانوں کے ذوق اور اشتغال کے نتائج بہ آسانی نکال لے سکتے ہیں۔ اب ہندوستان کے علوم و فنون مسلمانوں کے لیے غیر ملکی نہیں رہے تھے۔ بلکہ خود ان کے گھر کی دولت بن گئے تھے۔ اس لیے ممکن نہ تھا کہ ہندوستانی موسیقی کے علم و ذوق سے وہ تغافل برتتے، چنانچہ ساتویں صدی میں امیر خسرو جیسے مجتہد فن کا پیدا ہونا اس حقیقت حال کا واضح ثبوت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اب ہندوستانی موسیقی ہندوستانی مسلمانوں کی موسیقی بن چکی تھی اور فارسی موسیقی غیر ملکی موسیقی سمجھی جانے لگی تھی۔ سازگری، ایمن اور خیال تو امیر خسرو کی ایسی مجتہدانہ اختراعات ہیں کہ جب تک ہندوستانیوں کی آواز میں رس اور تار کے زخموں میں نغمہ ہے، دنیا ان کا نام نہیں بھول سکتی۔

مثنوی قرانُ السّعدین میں خود کہتے ہیں:

زمزمۂ 'سازگری' در 'عراق'
کردہ بہ گلبانگِ عراق اتّفاق

قول، ترانہ، سوہلہ تو گانے کی ایسی عام چیزیں بن گئی ہیں کہ ہر گویّے کی زبان پر ہیں، حالاں کہ یہ سب اُسی عہد کی اختراعات ہیں، کلاسیکل موسیقی اُن سے آشنا نہ تھی۔

غالباً مسلمان پادشاہوں سے بھی پہلے مسلمان صوفیوں نے اِس کی سرپرستی شروع کر دی تھی۔ مُلتان، اودھن، گور اور دہلی کی خانقاہوں میں وقت کے بڑے بڑے باکمال حاضر ہوتے تھے اور برکت وقبولیت کے لیے اپنا اپنا جوہرِ کمال پیش کرتے تھے۔ جہاں تک سلاطینِ ہند کا تعلق ہے، خلجی اور تغلق کے درباروں میں ہندوستانی موسیقی کی مقبولیت اور قدردانیوں کے واقعات تاریخ میں موجود ہیں، لیکن بس شاہی خاندان نے ہندوستانی موسیقی سے بہ حیثیت ایک فن کے خاص اعتنا کیا، وہ غالباً جون پور کا شرقی خاندان تھا، چناں چہ اُسی عہد میں خیال عام طور پر مقبول ہُوا، اور دُھرپد کی جگہ اہلِ فن اِس سے اعتنا کرنے لگے۔ اِسی عہد کے لگ بھگ دکن کے بہمنی اور نظام شاہی خاندانوں اور پھر بیجاپوری بادشاہوں کا ذوق وشوق نمایاں ہوتا ہے۔ چوں کہ اُس زمانے میں دکن اور مالوا کی سرزمین موسیقی کے علم وعمل کا تخت گاہ بن گئی تھی، اِس لیے یہ قدرتی بات تھی کہ مسلمان پادشاہوں کی سرپرستی اُسے حاصل ہو جاتی۔ ابراہیم عادل شاہ تو بہ قول ظہوری کے اِس اقلیم گاہ کا جگت گورو تھا اور اُس کے شوقِ موسیقی نے بیجاپور کے گھر گھر میں وجد وسماع کا چراغ روشن کر دیا تھا۔ ظہوری اُس کی مدح میں کیا خوب کہہ گیا ہے:

مروّت کردہ شبہا بر تو سیرِ بام ودر لارم
نمی باشد چراغے خانہ ہائے بے نوایاں را

مالوا، بنگال اور گجرات کے پادشاہوں کے ذاتی اشتغال وشوق کے واقعات تاریخ میں بہ کثرت ملتے ہیں۔ گور کے سلاطین مُلکی زبان اور مُلکی موسیقی دونوں کے سرپرست تھے، چناں چہ بنگالی زبان کی قدیم شاعری نے تمام تر انھی کی سرپرستی میں نشوونما پائی۔ مالوا کے باز بہادر کو تو روپ متی کے

عشق نے ہندی کا شاعر بنا دیا تھا اور موسیقی کا ماہر بھی۔ آج تک مالوا کے گھروں سے اُس کے دُہروں کی نوائیں سنی جا سکتی ہیں۔

اکبر کی قدر شناسیوں سے اِس فن کو جو عروج ملا، اُس کا حال عام طور پر معلوم ہے۔ ابوالفضل نے اُن تمام باکمالوں کا ذکر کیا ہے جو فتح پور اور آگرہ میں جمع ہو گئے تھے، اور اُن میں بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی۔ جہاں گیر نے اپنی توزک میں جا بجا ایسے اِشارے کیے ہیں، جن سے اُس کے ذاتی ذوق اور اشتغال کا ثبوت ملتا ہے۔ اُس کی حُسن پرست طبیعت کا لازمی تقاضہ یہی تھا کہ فنونِ لطیفہ کا قدر شناس ہو۔ چناں چہ شاعری، مصوّری اور موسیقی تینوں کا دِل دادہ اور اعلیٰ درجہ کا کمال شناس تھا۔ اُس کے دربار میں جس درجہ کے شاعر، مصوّر اور گویّے جمع ہو گئے تھے، پھر ہندوستان کی تاریخ میں جمع ہونے والے نہ تھے۔ اُس کے دربار کے ایک مصوّر نے الزبتھ کے سفیر کو اپنا کمال دِکھا کر حیران کر دیا تھا۔ اُس کے شاعرانہ ذوق کے لیے اُس کا یہ ایک شعر کفایت کرتا ہے۔

از من متاب رُخ کہ نیم بے تو یک نفس
یک دِل شکستنِ تو بہ صد خوں برابر ست

اُسی عہد میں یہ بات ہوئی کہ موسیقی کا فن بھی فنونِ دانش مندی میں داخل ہو گیا، اور اس کی تحصیل کے بغیر تحصیلِ علم اور تکمیلِ تہذیب کا معاملہ ناقص سمجھا جانے لگا۔ اُمرا اور شُرفا کی اولاد کی تعلیم و تربیت کے لیے جس طرح تمام فنونِ مدارس کی تحصیل کا اِہتمام کیا جاتا تھا، اسی طرح موسیقی کی بھی تعلیم کا اِہتمام کیا جاتا۔ مُلک کے ہر حصّہ سے باکمالانِ فن کی مانگ آتی تھی اور دہلی، آگرہ، لاہور اور احمد آباد کے گویّے بڑی بڑی تنخواہوں پر اُمرا اور شُرفا کے گھروں میں ملازم رکھے جاتے تھے۔ جو نوجوان تکمیلِ علم کے لیے بڑے شہروں میں آتے، وہ وہاں کے عالموں اور مُدرّسوں کے ساتھ وہاں کے باکمالانِ موسیقی کو بھی ڈھونڈتے، اور پھر اُن کے حلقۂ تعلیم میں زانوے تحصیل تہ کرتے۔ دکن میں احمد نگر، بیجاپور اور بُرہان پور کے اہلِ فن مشہور تھے۔ دوآبہ میں دہلی اور آگرہ کے، اور پنجاب میں لاہور، سیالکوٹ اور جھنگ کے۔

اُس عہد میں ایران اور توران سے جو افاضل اور اشراف آتے، وہ ہندوستانی موسیقی کے فہم و

مُناسبت کی ضرورت فوراً محسوس کر لیتے تھے اور چند سال بھی گزرنے نہیں پاتے کہ اُس کے مقام شناس بن جاتے تھے۔ محمد قاسم فرشتہ صاحبِ تاریخ کا باپ مازندران سے آکر احمد نگر میں مقیم ہوا تھا اور فرشتہ کی ولادت مازندران کی تھی، لیکن اُسے ہندوستانی موسیقی سے اِس قدر شغف ہوا کہ اِس موضوع پر ایک پوری کتاب تصنیف کر دی۔ یہ کتاب میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ علاء الملک تونی جو جلوس شاہجہانی کے ساتویں سال ہندوستان آیا اور فاضل خاں کے خطاب سے مخاطب ہوا، اور پھر اورنگ زیب کے عہد میں عہدۂ وزارت پر فائز ہوا، ہندوستانی موسیقی کا ایسا ماہر سمجھا جاتا تھا کہ وقت کے اساتذہ اُس سے استفاضہ کرتے تھے۔

اُس عہد کے کتنے مقدس علماء ہیں جن کے حالات پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ گو موسیقی کے اشتغال سے دامن بچائے رہے، لیکن فن کے ماہر اور نکتہ شناس تھے۔ مُلّا مبارک کے حالات میں خصوصیت کے ساتھ اِس کی تصریح ملتی ہے کہ ہندوستانی موسیقی کا ماہر و عالم تھا۔ اکبر نے اُسے تان سین کا گانا سنایا تو صرف اِتنی داد ملی کہ 'ہاں گا لیتا ہے'۔

مُلّا عبدالقادر جیسا متشرع اور متصلب شخص بھی بین بجانے میں پوری مہارت رکھتا تھا۔ اور فیضی نے ضروری سمجھا تھا کہ اکبر کی خدمت میں اُس کی سفارش کرتے ہوئے اِس مشاقی کا ذکر کر دے۔ علامہ سعد اللہ شاہجہانی جن کی فضیلتِ علمی اور ثقاہتِ طبع کا تمام معاصر اعتراف کرتے ہیں، موسیقی اور سنگیت کی ہر شاخ پر نظر رکھتے تھے اور ماہرانہ رائے دے سکتے تھے۔ اُن کے اُستاد مُلّا عبدالسلام لاہوری تھے۔ اُن کے حلقۂ درس کی عالم گیریوں نے سمرقند و بخارا تک کو مسخر کر لیا تھا۔ اور جب شاہجہاں نے شہزادوں کی تعلیم کے لیے تمام علمائے مملکت پر نظر ڈالی تھی، تو نظرِ انتخاب نے اُنھیں کی سفارش کی تھی۔ لیکن اُن کے ذوقِ موسیقی کا یہ حال تھا کہ جس طرح ہدایہ اور بزدوی کے مقامات حل کیا کرتے تھے، اُسی طرح موسیقی کی مشکلات بھی حل کر دیا کرتے تھے۔ شیخ معالی خاں جو مُلّا طاہر پٹنی محدثِ گجرات کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اور قاضی القضاۃ شیخ عبدالوہاب گجراتی کے پوتے تھے، اُن کے حالات میں صاحب مآثر الامرا نے لکھا ہے کہ موسیقی کے شیفتہ اور اُس کی باریکیوں کے دقیقہ سنج تھے۔ مُلّا شفیعائے یزدی مخاطب بہ دانش مند خاں کہ

سرآمد علمائے عصر تھا، اور شاہجہاں کے دربار میں اُس کا مباحثہ مُلا عبدالحکیم سیالکوٹی سے معلوم و مشہور ہے، ہندوستان آتے ہی ہندوستانی موسیقی میں ایسا باخبر ہوگیا کہ وقت کے باکمالانِ فن کو اُس کے فضل و کمال کا اعتراف کرنا پڑا۔ حکیم برنیر فرنساوی صاحبِ سفرنامۂ ہند اِسی دانش مندخاں کی سرکار میں ملازم تھا، اور غالباً اُسی کی صُحبت کا یہ نتیجہ تھا کہ حکمائے فرنگ کا اُسے ہم مشرب لکھا گیا ہے۔

شیخ علاءُالدّین جو اپنے عہد کے مشہور صوفی گزرے ہیں، اور جن کی ایک غزل سماع کی مجلسوں میں بہ کثرت گائی جاتی ہے:

نہ دانم آں گُلِ رعنا چہ رنگ و بُو دارد
کہ مُرغِ ہر چمنے گفتگوے اُو دارد
نشاطِ بادہ پرستاں بہ مُنتہیٰ برسید
ہنوز ساقیِ ما بادہ در سُبُو دارد

اُن کے حالات میں سب لکھتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقی کے ماہر اور آلاتِ موسیقی کے غیر معمولی مشّاق تھے۔

شیخ جمالی صاحب سیرالعارفین اور اُن کے لڑکے شیخ گدائی، دونوں کا فنِ موسیقی میں توغّل معلوم ہے۔ دورِ آخر میں مرزا مظہر جانِ جاناں اور خواجہ میر درد فنِ موسیقی کے ایسے ماہر تھے کہ وقت کے بڑے بڑے کلاونت اپنی چیزیں بہ غرضِ اصلاح پیش کرتے اور اُن کے سر کی ایک ہلکی سی جُنبش کو بھی اپنے کمالِ فن کی سند تصوّر کرتے۔

شیخ عبدُالواحد بلگرامی شیر شاہی عہد کے ایک قابلِ قدر بزرگ تھے۔ سلوک و تصوّف میں اُن کی کتاب سنابل مشہور ہو چکی ہے۔ بدایونی اُن کے حالات میں لکھتے ہیں کہ ہندی موسیقی میں نقش آرائیاں کرتے تھے اور وجد و حال کی مجلسیں اُن سے گرم ہوتی تھیں۔

بیرم خاں موسیقیِ ہند کا بڑا قدر شناس تھا، اور اُس کے لڑکے عبدالرحیم خان خاناں کی قدر شناسیاں تو اِس درجہ تک پہنچ گئی تھیں کہ اکبر اور جہاں گیر کی شاہانہ فیاضیاں بھی اُس کا مقابلہ نہ کر سکیں۔

عبدالباقی نہاوندی نے مآثر رحیمی کے خاتمہ میں جہاں اُن علما و شعرا کا تذکرہ کیا ہے جو خان خاناں کی سرکار سے وابستہ تھے، وہاں موسیقی کے باکمالوں کے نام بھی گنوائے ہیں۔ اُن میں ایرانی اور ہندوستانی، ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ شاہ نواز خاں صفوی کے حالات میں صاحبِ مآثر الامرا نے لکھا ہے کہ "شیفتۂ موسیقی بود و خوانندہ ہا و سازندہ ہا کہ پیش خود جمع کردہ بود، نظیر نداشتند"۔ قریب قریب یہی الفاظ ہوں گے۔ حافظہ سے لکھ رہا ہوں اور کتاب دیکھے ہوئے سالہا سال گزر گئے۔ زین خاں کوکہ کا علومِ درسیہ میں شغف معلوم ہے۔ پنجاب کی صوبیداری کے زمانے میں بھی اُس نے درس و تدریس علوم کا مشغلہ بالالتزام جاری رکھا تھا۔ لیکن اُس کے حالات میں بھی سب لکھتے ہیں کہ "بکبت و راگ شغفے داشت، و ساز ہا بہ کمالِ حُسن و خوبی می نواخت"۔ اُس کا لڑکا مُغل خان بھی اس باب میں اپنے باپ کا جانشیں تھا۔ خانِ کلاں میر محمد جو شمس الدین اتگہ کا بھائی تھا۔ موسیقیِ ہند کے علم و مہارت میں ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ مرزا غازی خاں بن جانی بیگ حاکمِ سندھ و قندھار کی نسبت سب لکھتے ہیں کہ نغمہ پردازی، طنبور نوازی اور تمام سازوں کے بجانے میں بے نظیر تھا۔ مُلّا مرشد یزدجردی نے اُس کی مدح میں یہ رُباعی کہی تھی:

گر نغمۂ سازت بہ سکوں می آید
رمزے ست بہ گویمت کہ چوں می آید
ازبسکہ بہ گرد زخمہ ات می گردد
پیچیدہ ز طنبور بروں می آید

خان زمان میر خلیل نے جو یمین الدولہ آصف خاں کا داماد تھا، اِس فن میں ایسی مہارت بہم پہنچائی تھی کہ لوگ اپنے اِختلافات اُس کے آگے فیصلہ کے لیے پیش کرتے۔ سرس بائی جو شہزادہ مُراد بخش کی محبوبہ تھی، خیال گانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی، مگر خود شہزادہ کی فن دانی کا مرتبہ اِتنا بلند تھا کہ وہ اُس کی شاگردی پر ناز کرتی۔ اورنگ زیب نے جب مُراد کو قید کیا تو سرس بائی بھی تیار ہوگئی کہ اُس کے ساتھ قید و بند کی سختیاں گوارا کرے۔ چناں چہ مُراد کے ساتھ قلعہ گوالیار میں عرصہ تک محبوس رہی۔

مرزا عیسیٰ خاں ترخاں جس نے جانی بیگ کی وفات کے بعد سندھ میں بڑی شورش برپا کی تھی، نغمہ سنجی اور ساز نوازی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔

اب اِس وقت حافظہ کی گرہیں کھلنے لگی ہیں، تو بے شمار واقعات سامنے آرہے ہیں۔ شہزادہ خرم کی ماں مان متی جو راجہ اودے سنگھ کی بیٹی تھی، جب جہاں گیر کے محل میں آئی تو اُس کے گانے کا محل میں شہرہ ہُوا۔ جہاں گیر چوں کہ خود ماہرِ فن تھا، اِس لیے اُس نے اِمتحان لیا اور جب دیکھا کہ اِمتحان میں پوری اُتری، تو بہت خوش ہُوا اور خوش آواز خواصوں کا ایک حلقہ اُن کے سپرد کر دیا کہ اپنی تعلیم و تربیت سے اُنھیں تیّار کرے۔ خود خُرّم یعنی شاہجہاں کے ذوق و مُناسبتِ فن کا یہ حال تھا کہ تان سین کا جانشین لال خاں اُس کا نام لے کر کان پکڑتا تھا۔ دُھرپد میں شاہجہاں کے رسوخِ ذوق کا مؤرخوں نے خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

نظامُ الملک آصف جاہ کے لڑکے ناصر جنگ شہید کو موسیقی کے شوق نے سنسکرت زبان کی تحصیل کا شوق دِلایا، تاکہ کلاسیکل موسیقی کی قدیم کتابوں کا براہ راست مُطالعہ کر سکے۔ اُس کے حالات میں صاحبِ شہادت نامہ لکھتے ہیں کہ زبانِ سنسکرت سے واقف اور موسیقی و سنگیت میں ماہر تھا۔

اُس عہد میں ایک ایک امیر کی فیاضیاں ترقیِ فن کے لیے شاہانہ فیاضیوں سے کم نہیں ہوتی تھیں۔ شیخ سلیم چشتی کا پوتا اِسلام خاں جب جہاں گیر کے عہد میں بنگال کا صوبیدار ہُوا، تو اُس کی سرکار میں اسّی ہزار روپیہ ماہوار راگ اور رقص کے طائفوں پر خرچ کیا جاتا تھا۔ صاحبِ مآثر الامرا لکھتے ہیں کہ اُس کے دسترخان پر ایک ہزار لنگریاں[1] کمالِ تکلف و اِہتمام سے دونوں وقت چنی جاتی تھیں، مگر خود اُس کا یہ حال تھا کہ جوار کی روٹی اور ساٹھی کا خشکہ ساگ کے ساتھ کھاتا، اور کسی دوسرے کھانے میں ہاتھ نہ ڈالتا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ عُمر بھر جامۂ خاصہ کے نیچے گاڑھے کا کُرتا پہنتا رہا اور پگڑی کے نیچے بھی گاڑھے کی طاقیہ[2] اوڑھتا۔

---

[1] لنگری لکڑی کی روغن کی ہوئی سینی کو کہتے ہیں، جو لکڑی کے طشت کی طرح بہت بڑی ہوتی تھی اور ایک مسلّم گوسفند بریاں اُس میں رکھا جا سکتا تھا۔

[2] طاقیہ ہلکی ٹوپی کو کہتے ہیں جو گھر میں سر پر رکھ لیتے ہیں۔ آج کل بھی عرب میں اِس ٹوپی کو طاقیہ ہی کہتے ہیں۔

اورنگ زیب کے فقیہانہ تقشّف سے اگرچہ فنونِ لطیفہ کی گرم بازاری سرد پڑ گئی، مگر یہ جو کچھ ہوا، صرف شاہی دربار تک محدود تھا۔ پچھلی آب پاشیوں نے مُلک کے ہر گوشہ میں جو نہریں رواں کر دی تھیں وہ اتنی تنگ مایہ نہ تھیں کہ شاہی سرپرستی کا رُخ پھرتے ہی خشک ہونا شروع ہو جاتیں۔ بلاشبہ عالم گیری عہد میں شاہی کارخانے بند ہو گئے تھے، لیکن مُلک کے ہزاروں لاکھوں گھروں کے کارخانے کون بند کر سکتا تھا؟ میں نے اِس مکتوب کی ابتدا میں فارسی کتاب راگ درپن کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب فقیر اللہ سیف خاں نے مُرتّب کی تھی، جو اِسی عالم گیری عہد کا ایک امیر اور ناصر علی سرہندی کا ممدوح تھا۔ شیر خاں لودھی صاحبِ مرأۃ الخیال بھی اِسی عہد میں تھا، جس نے ایرانی موسیقی اور ہندوستانی موسیقی دونوں میں دستگاہ پیدا کی، اور پھر دونوں پر ایک مبسوط کتاب لکھی۔ تذکرہ مرأۃ الخیال میں بھی ایک فصل موسیقی پر لکھی ہے، اور اپنے ذوقِ فن کا ذکر کیا ہے۔ موسیقی پر اُس کی ایک کتاب میری نظر سے گزر چکی ہے۔ اُس کا ایک خوش خط نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

اِس سلسلہ میں خود اورنگ زیب کی زندگی کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔

بُرہان پور کے حوالی میں ایک بستی زین آباد کے نام سے بس گئی تھی۔ اِسی زین آباد کی رہنے والی ایک مُغنّیہ تھی، جو "زین آبادی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور اُس کے نغمہ و حُسن کی تیر افگنیوں نے اورنگ زیب کو زمانۂ شہزادگی میں زخمی کیا۔ صاحبِ مآثر الامرا نے اِس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کیا خوب شعر لکھا ہے:

عجب گیرندہ دامے بود در عاشق رُبائی ہا
نگاہِ آشنائے یار پیش از آشنائی ہا

اورنگ زیب کے اِس مُعاشقہ کی داستان بڑی ہی دل چسپ ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اولوالعزمیوں کی طلب نے اُسے لوہے اور پتھر کا بنا دیا تھا، لیکن ایک زمانہ میں گوشت پوست کا آدمی بھی رہ چکا تھا اور کہہ سکتا تھا کہ:

گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی

ابھی تھوڑی دیر ہوئی، ہم یمین الدولہ کے داماد میر خلیل خانِ زمان کا تذکرہ کر رہے تھے۔ اس خانِ زمان کی بیوی اورنگ زیب کی خالہ ہوتی تھی۔ ایک دن اورنگ زیب برہان پور کے باغِ آہو خانہ میں چہل قدمی کر رہا تھا، اور خان زمان کی بیوی یعنی اُس کی خالہ بھی اپنی خواصوں کے ساتھ سیر کے لیے آئی ہوئی تھی۔ خواصوں میں ایک خواص زین آبادی تھی، جو نغمہ سنجی میں سحر کار اور شیوۂ دل ربائی و رعنائی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ سیر و تفریح کرتے ہوئے یہ پورا مجمع ایک درخت کے سائے سے گزرا، جس کی شاخوں میں آم لٹک رہے تھے۔ جوں ہی مجمع درخت کے نیچے پہنچا، زین آبادی نے نہ تو شہزادہ کی موجودگی کا کچھ پاس لحاظ کیا، نہ اُس کی خالہ کا، بے باکانہ اُچھلی، اور ایک شاخِ بلند سے ایک پھل توڑ لیا۔ خان زمان کی بیوی پر یہ شوخی گراں گزری اور اُس نے ملامت کی، تو زین آبادی نے ایک غلط انداز نظر شہزادہ پر ڈالی، اور پشواز سنبھالتے ہوئے آگے نکل گئی۔ یہ ایک غلط انداز نظر کچھ ایسی قیامت کی تھی کہ اُس نے شہزادہ کا کام تمام کر دیا، اور صبر و قرار نے خدا حافظ کہا:

بالا بلندِ عشوہ گرِ سروِ نازِ من
کوتاہ کرد قصۂ زہدِ درازِ من

صاحبِ ماثر الامرا نے لکھا ہے کہ "بہ کمالِ ابرام و سماجت زین آبادی از خالۂ محترمۂ خود گرفت۔ بہ آں ہمہ تفقہ خشک و تفقہ بحت شیفتہ و دل دادۂ او شد، قدحِ شراب بہ دستِ خود پُر کردہ می داد۔ گویند روزے زین آبادی ہم قدحِ بادہ پُر کردہ بہ دستِ شہزادہ داد و تکلیفِ شرب نمود۔" یعنی بڑی منت و الحاح کر کے اپنی خالہ سے زین آبادی کو حاصل کیا، اور باوجود اُس زہدِ خشک اور خالص تفقہ کے، جس کے لیے اُس عہد میں بھی مشہور ہو چکا تھا، اُس کے عشق و شیفتگی میں اِس درجہ بے قابو ہو گیا کہ اپنے ہاتھ سے شراب کا پیالہ بھر بھر کر پیش کرتا اور عالمِ نشہ و سرور کی رعنائیاں دیکھتا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن زین آبادی نے اپنے ہاتھ سے جام لبریز کر کے اورنگ زیب کو دیا اور اصرار کیا کہ لبوں سے لگا لے۔ دیکھیے عرفی کا ایک شعر کیا موقعہ سے یاد آ گیا ہے اور کیا چسپاں ہوا ہے:

ساقی تونی و سادہ دِلی ہیں کہ شیخ شہر
باور نمی کُند کہ ملک مے گُسار شُد

شہزادہ نے ہر چند عجز و نیاز کے ساتھ اِلتجائیں کیں کہ میرے عِشق و دِل باختگی کا اِمتحان اِس جام کے پینے پر مَوقوف نہ رکھو:

مے حاجت نیست مستیم را
در چشمِ تو خُمار باقیست

لیکن اُس عیّار کو رحم نہ آیا:

ہنوز ایمان و دِل بسیار غارت کردنی دارد
مُسلمانی میاموز آں دو چشمِ نا مُسلماں را

ناچار شہزادہ نے اِرادہ کیا کہ پیالہ کو مُنھ سے لگالے۔ گویا وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا کی پوری رویداد پیش آگئی:

عِشقش خبر ز عالمِ مدہوشی آورد
اہلِ صلاح را بہ قدح نوشی آورد

لیکن جوں ہی اُس فسوں ساز نے دیکھا، کہ شہزادہ بے بس ہو کر پینے کے لیے آمادہ ہو گیا ہے، فوراً پیالہ اُس کے لبوں سے کھینچ لیا اور کہا: "غرضِ اِمتحانِ عِشق بود، نہ کہ تلخ کامیِ شُما"

اِیں جورِ دیگر است کہ آزارِ عاشِقاں
چنداں نمی کُند کہ بہ آزار خو کُند

رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ شاہجہاں تک خبریں پہنچنے لگیں۔ اور وقائع نویسوں کے فردوں میں بھی اِس کی تفصیلات آنے لگیں۔ دارا شکوہ نے اِس حِکایت کو اپنی سعایت و غمّازی کا دست مایہ بنایا۔ وہ باپ کو بار بار توجّہ دلاتا: "ببینید، ایں مُزوّرِ ریائی چہ صلاح و تقویٰ ساختہ است"۔ ابوالفیضی نے کیا خوب کہا ہے:

چہ دست می بری اے تیغِ عِشق؛ اگر دادست
بہ زبانِ ملامت گرِ زُلیخا را

معلوم نہیں اِس قضیہ کا غُنچہ کیوں کر گُل کرتا، لیکن قضا و قدر نے خود ہی فیصلہ کر دیا۔ یعنی عین عروجِ شباب میں زین آبادی کا اِنتقال ہو گیا۔ اورنگ آباد میں بڑے تالاب کے کنارے اُس کا مقبرہ آج تک موجود ہے:

خود رفتہ ایم و کنجِ مزارے گرفتہ ایم
تا بارِ دوشِ کس نہ شود اُستخوانِ ما

آپ نے عاقل خاں رازی کے حال میں یہ واقعہ پڑھا ہوگا کہ زمانۂ شہزادگی میں اورنگ زیب کو ایک پرستارِ خاص کی موت سے سخت صدمہ پہنچا تھا، لیکن اُسی دن شکار کے اہتمام کا حکم دیا گیا۔ اِس بات پر وابستگانِ دولت کو تعجب ہُوا کہ سوگواری کی حالت میں سیر و تفریح اور شکار کا کیا موقعہ تھا؟ جب اورنگ زیب شکار کے لیے محل سے نکلا، تو عاقل خاں نے کہ میرِ لشکر تھا، تنہائی کا موقعہ نکال کر عرض کیا، اِس غم و اندوہ کی حالت میں شکار کے لیے نکلنا کسی ایسی ہی مصلحت پر مبنی ہوگا، جس تک ہم ظاہر بینوں کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔ اورنگ زیب نے جواب میں یہ شعر پڑھا:

نالہ ہائے خانگی دِل را تسلّی بخش نیست
در بیاباں می تواں فریاد خاطر خواہ کرد

اِس پر عاقل خاں کی زبان سے بے ساختہ یہ شعر نکل گیا:

عِشق چہ آساں نمود، آہ چہ دُشوار بُود
ہجر چہ دُشوار بود، یار چہ آساں گرفت

اورنگ زیب پر رقت کا عالم طاری ہو گیا۔ دریافت کیا کہ یہ شعر کس کا ہے؟ عاقل خاں نے کہا: اُس شخص کا ہے جو نہیں چاہتا کہ اپنے آپ کو زُمرۂ شُعرا میں محسوب کرائے۔ اورنگ زیب سمجھ گیا کہ خود عاقل خاں کا ہے۔ بہت تعریف کی، اور اُس دن سے اُس کی سرپرستی اپنے ذِمّہ لے لی۔ اِس حکایت میں جس "پرستارِ خاص" کی موت کا ذِکر آیا ہے اُس سے مقصود یہی زین آبادی ہے۔

صاحبِ مآثر الاُمرا نے خان زمان کے حالات میں لکھا ہے کہ فنِ موسیقی میں پوری مہارت رکھتا تھا، اور کاروبارِ منصب کے اِنہماک کے ساتھ راگ و رنگ کی مشغولیتیں بھی برابر جاری رہتی تھیں۔ پری چہرگانِ

خوش آواز اور مغنیانِ عشوہ طراز اُس کی سرکار میں ہمیشہ جمع رہتی تھیں۔ اِنھیں میں زین آبادی بھی تھی، جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُس کی مدخولہ تھی۔

خود اورنگ زیب بھی موسیقی کے فن سے بے خبر نہ تھا، کیوں کہ تمام شہزادوں کی طرح اُس نے بھی اِس کی تحصیل کی ہوگی۔ البتہ آگے چل کر اُس کی طبیعت کی اُفتاد نے دوسری راہ اختیار کی، اِس لیے اِس کے اِشتغال وذوق سے کنارہ کش ہوگیا، اور سلطنت پر قبضہ پانے کے بعد تو سرے سے یہ کارخانہ ہی بند کردیا۔ گویّوں نے موسیقی کا جنازہ نکالا، تو اُس نے کہا، اِس طرح دفن کرنا کہ پھر قبر سے نہ اُٹھ سکے۔ لیکن اورنگ زیب کے سارے منصوبوں کی طرح سلطنت کا یہ پرہیزی مزاج بھی زیادہ دنوں تک نہ چل سکا، اور اُس کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ جس طرح اِنگلستان میں پیوریٹن (PURITAN) عہد کی خشک مزاجیاں اِعادۂ حال کے ساتھ ہی ختم ہوگئی تھیں، اُسی طرح یہاں بھی اورنگ زیب کی آنکھ بند ہوتے ہی سلطنت کا مزاج پھر لوٹ آیا۔ فرخ سیر اور محمد شاہ کے عہد کی تردماغیاں دراصل اِسی عالم گیری خشک مزاجیوں کا ردّ عمل تھیں۔ سیّد عبدالجلیل محدث بلگرامی نے فرخ سیر کی شادی کی تبریک میں جو مثنوی لکھی ہے، اُس سے اُس عہد کی عشرت مزاجیوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کے قدمائے فن نے موسیقی اور رقص کی ایک خاص قسم ایسی قرار دی ہے، جس کی نسبت اُن کا خیال تھا کہ صحرائی جانوروں کو بے خود کرکے رام کرنے میں خصوصیت کے ساتھ موثر ہے۔ اکبر کے زمانے میں رقص اور گانے کی یہ قسم شکارِ قمرغہ کے سروسامان میں داخل ہوئی، اور اِس کے طائفے باکمالانِ فن کی نگرانی میں تیار کرائے گئے۔ آنند رام مخلص نے مراۃ المصطلحات میں اِس طریقِ شکار کی بعض دِل چسپ تفصیلات لکھی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ جب شکارِ قمرغہ کا اِہتمام کیا جاتا تھا تو یہ طائفے شکارگاہ میں بھیج دیے جاتے تھے اور رقص وسرود شروع کردیتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد آہستہ آہستہ چاروں طرف سے ہرن سر نکالنے لگتے اور پھر رقص وسرود کی محویت اُنھیں بالکل طائفے کے قریب پہنچا دیتی۔ جہاں گیر نے ایک مرتبہ شکارِ قمرغہ کا قصد کیا۔ اور اسی رقص وسرود کا جال بچھایا۔ جب ہرنوں کے غول ہر طرف سے نکل کر سامنے آکھڑے ہوئے تو نورجہاں کی زبان پر بے اختیار امیر خسرو کا یہ شعر طاری ہوگیا:

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف
بہ اُمیدِ آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

یہ شعر سُن کر جہاں گیر کی غیرتِ مردمی نے گوارا نہ کیا کہ شکار کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ دِل گرفتہ واپس آگیا۔

یہ خیال کہ جانور گانے سے مُتاثر ہوتے ہیں، دنیا کی تمام قوموں کی قدیمی روایتوں میں پایا جاتا ہے تورات میں ہے کہ حضرت داؤد کی نغمہ سرائی پرندوں کو بے خود کر دیتی تھی۔ یونانی روایات میں بھی ایک سے زیادہ اشخاص کی نسبت ایسا ہی عقیدہ ظاہر کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے قدمائے فن نے تو اِسے ایک مُسلّمہ حقیقت مان کر اپنے بے شمار عملیات کی بنیادیں اِسی عقیدہ پر استوار کی تھیں۔ سانپ، گھوڑے اور اُونٹ کا تاثر عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ حُدی کی لَے اگر رُک جاتی ہے، تو محمل کی تیز رفتاری بھی رُک جاتی ہے۔

حُدی را تیز تر می خواں، چوں محمل را گراں بینی

البیرونی نے کتابُ الہند میں راگ کے ذریعے شکار کرنے کے طریقوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ خود اپنا مشاہدہ نقل کرتا ہے کہ شکاری نے ہرن کو ہاتھ سے پکڑ لیا تھا، اور ہرن میں بھاگنے کی قوت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ ہندوؤں کا یہ قول بھی نقل کرتا ہے کہ اگر ایک شخص اس کام میں پوری طرح ماہر ہو، تو اُسے ہاتھ بڑھا کر پکڑنے کی بھی ضرورت پیش نہ آئے۔ وہ صَید کو جس طرف لے جانا چاہے صِرف اپنے راگ کے زور سے لگائے لے جائے۔ پھر لکھتا ہے: جانوروں کی اِس محویت و تسخیر کو عوام گنڈے اور تعویذ کا اثر سمجھتے ہیں، حالاں کہ یہ محض گانے کی تاثیر ہے۔ پھر ایک دوسرے مقام میں جہاں جزیرہ سراندیپ کا ذکر کیا ہے، لکھتا ہے: یہاں بندر بہت ہیں۔ ہندوؤں میں مشہور ہے کہ اگر کوئی مُسافر اُن کے غول میں پھنس جائے اور رامائن کے وہ اشعار، جو ہنومان کی مدح میں لکھے گئے ہیں، پڑھنے لگے تو بندر اُس کے مُطیع ہو جائیں گے اور اُسے کچھ نقصان نہیں پہنچے گا۔ پھر کہتا ہے کہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو اِس کی تہ میں بھی وہی گانے کی تاثیر کام کرتی ہوگی یعنی رامائن کے اشعار کے مطالب کا یہ اثر نہ ہوگا، اشعار کی لَے اور نغمہ سرائی کی تاثیر ہوگی۔

پہلی تصریح غالباً اُس باب میں ہے جو فی ذکر مسلوم لھم کاسرۃ الاحنجۃ علی افق الجھل کے عنوان سے ہے۔ اور دوسری تصریح اس کے بعد کے باب میں ملے گی جو فی معارف شتی من بلادھم وانھا دھم کے عنوان سے لکھا ہے۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ زمانۂ حال کا علم الحیوان اس خیال کی واقعیت تسلیم نہیں کرتا، اور تاثرات کے مشاہدات کو دوسری علتوں پر محمول کرتا ہے۔ سانپ کے بارے میں تو کہا جاتا ہے کہ اُس میں سرے سے سماعت کا حاسّہ ہی نہیں ہے۔

والہ داغستانی صاحبِ ریاض الشعرا، قزلباش خاں اُمید، امیر معز فطرت موسوی، مومن الدولہ اسحاق خاں شوستری، یہ سب تازہ ولایت ایرانی تھے، لیکن ہندوستان کی صحبتوں سے آشنا ہوتے ہی اُنھوں نے محسوس کیا کہ موسیقیِ ہند سے واقفیت پیدا کیے بغیر اپنی دانش و شایستگی کی مسند نہیں سنبھال سکتے۔ اِس لیے اُس کی تحصیل ناگزیر ہے۔ قزلباش خاں اُمید کی مجالسِ طرب کا حال قاضی محمد [صادق] خاں اختر نے اپنے مکاتیب میں لکھا ہے، اُس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اِس فن میں کس درجہ دستگاہ اُسے حاصل ہو گئی تھی۔ شیخ علی حزیں ایرانی موسیقی سے پوری طرح باخبر تھے۔ لیکن ہندوستان میں اُنھوں نے ہندوستانی موسیقی کی بھی تحصیل کی۔ پٹنہ کے قیام کے زمانے میں اُن کا دستور تھا کہ ہفتہ کے دو دن موسیقی کی صحبت کے لیے مخصوص کر دیے تھے۔ شہر کے باکمال حاضر ہوتے اور فن کی باریکیوں کے نمونے پیش کرتے۔

اودھ کی نوابی کے دور میں تفضل حسین خاں علامہ کے علم و فضل کی بڑی شہرت ہوئی۔ شوستری صاحبِ تحفۃ العالم کلکتہ میں اُن سے ملا تھا، جب وہ اودھ کی سفارت کے منصب پر مامور تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ تمام علومِ عقلیہ کے ساتھ موسیقی میں بھی درجۂ اجتہاد رکھتے ہیں، اور شوق و ذوق کا یہ حال ہے کہ جب تک ساز پر راگ چھیڑا نہیں جاتا، اُن کی آنکھیں نیند سے آشنا نہیں ہوتیں۔ ایک ماہرِ فن سازندہ صرف اِس کام کے لیے ملازم ہے کہ شب کو خواب گاہ میں خواب آور گت چھیڑ دیا کرے۔

لکھنؤ کے علمائے فرنگی محل میں بحر العلوم کی نسبت اُن کے بعض معاصروں نے لکھا ہے کہ فنِ موسیقی

میں اُن کا رسوخ عام طور پر مسلّم تھا۔

البتہ یہ ظاہر ہے کہ قوموں کے عروج و ترقی کے زمانے میں جو اِشتغال تحسینِ فکر اور تہذیبِ طبع کا باعث ہوتا ہے، وہی دورِ تنزل میں فکر کے لیے آفت اور طبیعت کے لیے مُہلک بن جاتا ہے۔ ایک ہی چیز حُسنِ اِستعمال اور اِعتدالِ عمل سے فضل و کمال کا زیور ہوتی ہے، اور سوءِ اِستعمال اور اِفراط و تفریطِ عمل سے بداخلاقی اور صد عیبی کا دھبّہ بن جاتی ہے۔ موسیقی کا ایک شوق تو اکبر کو تھا کہ اپنی یلغاروں کے بعد جب کمر کھولتا، تو مجلسِ سماع و نشاط سے اُن کی تھکن مٹاتا، اور پھر ایک شوق محمد شاہ رنگیلے کو تھا، کہ جب تک محل کی عورتیں اُسے دھکیل دھکیل کر پردہ سے باہر نہ کر دیتیں، دیوان خانہ میں قدم نہیں رکھتا۔ صفدر جنگ جب دیوان کی مہمّات سے تھک جاتا تو موسیقی کے باکمالوں کو باریاب کرتا۔ اُسی کی نسل میں واجد علی شاہ کا یہ حال تھا کہ جب طبلہ بجاتے بجاتے تھک جاتا، تو تازہ دم ہونے کے لیے اپنے وزیر علی نقی کو باریابی کا موقعہ دیتا۔ موسیقی کا شوق دونوں کو تھا، مگر دونوں کی حالتوں میں جو فرق تھا، وہ محتاجِ بیان نہیں۔

سارت مشرقۃ وسرت مغربًا

شتان بین مشرق و مغرب

اِس بات کی عام طور پر شہرت ہو گئی ہے کہ اِسلام کا دینی مزاج فنونِ لطیفہ کے خلاف ہے، اور موسیقی محرماتِ شرعیہ میں داخل ہے۔ حالاں کہ اِس کی اصلیت اِس سے زیادہ کچھ نہیں کہ فقہا نے سدِّ وسائل کے خیال سے اِس بارے میں تشدد کیا، اور یہ تشدد بھی بابِ قضا سے تھا، نہ کہ بابِ تشریع سے۔ قضا کا میدان نہایت وسیع ہے۔ ہر چیز جو سوءِ اِستعمال سے کسی مفسدہ کا وسیلہ بن جائے، قضاءً روکی جا سکتی ہے، لیکن اِس سے تشریع کا حکم اصلی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا۔ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ؟ لیکن میں یہ مبحث یہاں نہیں چھیڑنا چاہتا۔ یہاں جس زاویۂ نگاہ سے معاملہ پر نظر ڈالی جا رہی ہے وہ دوسرا ہے۔

مومن! آکیش محبت میں کر سب کچھ ہے روا حسرت حرمتِ صہبا و مزامیر نہ کھینچ

دیکھیے، بات کیا کہنی چاہتا تھا اور کہاں سے کہاں جا پڑا؟ اب لکھنے کے بعد صفحوں پر نمبر لگائے تو معلوم ہوا کہ فل اسکیپ کے چھتیس صفحے سیاہ ہو چکے ہیں۔ بہر حال اب قلم روکتا ہوں:

حرفِ نامنظورِ دِل یک حرف ہم بیش ست و بس
معنیے دِل خواہ گر صد نسخہ باشد ہم کم است

—:—

اتر پردیش اردو اکادمی کی شائع کردہ یونی ورسٹی سطح کی

نصابی کتابیں

منتخب غزلیں		۷/-
منتخب نظمیں		۱۰/۵۰
انتخاب افسانہ		۵/-
انتخاب نثر (حصہ اول)		۴/۵۰
انتخاب نثر (حصہ دوم)		۵/-
انتخاب منظومات (حصہ اول)		۳/-
انتخاب منظومات (حصہ دوم)		۴/۵۰
انتخاب مراثی		۹/۵۰
انتخاب قصائد		۵/-
بکٹ کہانی	مرتبۂ نورالحسن ہاشمی	۷/-
انارکلی	امتیاز علی تاج	۹/-
ابتدائی اردو	حکم چند نیّر	۸/-
لازمی نصاب	"	۵/۵۰
انتخاب غبار خاطر	ابوالکلام آزاد	۵/-
انتخاب خطوط غالب		۴/۵۰

ملنے کا پتہ:

اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۰

فون: ۳۹۵۱۹۲

INTIKHABE
GHUBAR-E-KHATIR

Rs. 14/-

Northern Offset Press Lucknow Ph. : 2240858, 2419790